احمد بشیر بحیثیت خاکہ نگار: ایک جائزہ

(تحقیقی مقالہ برائے بی ایس اردو)

مقالہ نگار

صبا اکرم

نگران مقالہ

ڈاکٹر محمد ساجد خان

شعبہ اردو جامعہ کراچی

۲۰۲۵ء

انتساب

اپنے پیارے ابو جان اور پیاری امی جان کے نام

مقدمہ

اردو ادب میں خاکہ نگاری ایک ایسی صنف ہے جو انسانی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر کشی کا فن ہے۔ یہ صنف محض معلومات کا انبار نہیں بلکہ تخلیقی اظہار کا ایک منفرد وسیلہ ہے جس میں خاکہ نگار اپنے مشاہدات، تجربات اور فنی مہارت کے ذریعے کسی شخصیت کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ کاغذ پر زندہ ہو اٹھتی ہے۔

خاکہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے ماہرین ادب نے جو مختلف زاویے اپنائے ہیں ان کو مد نظر رکھتے ہوئے خاکہ نگاری کی تعریفیں پیش کی جائیں گی۔ بشیر سیفی کے مطابق "خاکہ ایسا تخلیقی مضمون ہے جس میں کسی فرد کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو ذاتی حوالے سے اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔" یہ تعریف خاکے کی تخلیقی نوعیت، شخصی عنصر اور اختصار کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔

اردو میں خاکہ نگاری کی روایت کا آغاز اگرچہ تذکروں سے ہوا، لیکن باقاعدہ خاکہ نگاری کا سہرا محمد حسین آزاد کے سر جاتا ہے۔ ان کی تصنیف "آب حیات" میں شخصی تصویریں خاکے کے واضح نمونے ہیں۔ اس کے بعد عبدالحلیم شرر، رسوا اور خواجہ حسن نظامی نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ تاہم، جدید خاکہ نگاری کی ابتداء مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکے "نذیر احمد کی کہانی" سے ہوتی ہے جسے اردو ادب میں پہلا مکمل خاکہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں خاکہ نگاری نے ایک مستقل صنف کی حیثیت اختیار کی۔ رشید احمد صدیقی نے "گنجہائے گراں مایہ" اور "ہم نفساں رفتہ" جیسے مجموعوں کے ذریعے خاکہ نگاری کو نئی بلندیاں عطا کیں۔ ترقی پسند تحریک کے دور میں عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو نے خاکہ نگاری میں نئے تجربات کیے۔ منٹو نے خاکے کو انشائیے کی حدود سے نکال کر افسانے کے قریب پہنچا دیا۔

خاکہ نگاری کے فنی لوازمات میں اختصار، مشاہدے کی گہرائی، وحدت تاثر، سراپا نگاری، واقعات کا انتخاب، غیر جانبداری اور شگفتہ اسلوب شامل ہیں۔ ایک کامیاب خاکہ نگار کو شخصیت کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں کا باریک بینی سے مشاہدہ کرنا ضروری ہے۔ خاکے میں صرف خوبیاں نہیں بلکہ خامیاں بھی متوازن انداز میں پیش کی جانی چاہئیں تاکہ شخصیت اپنی اصل صوت میں سامنے آئے۔

اس تحقیقی کام کا محور احمد بشیر (**۱۹۲۳سے ۲۰۰۴**) کی خاکہ نگاری ہو گا۔ احمد بشیر ایک ہمہ جہت شخصیت تھے - صحافی، کالم نگار، ناول نگار، فلم ساز، مکتوب نگار اور خاکہ نگار۔ ان کی زندگی جرأت، بے باکی اور سچائی کی علامت تھی۔ **۲۶** دسمبر **۱۹۲۳**ء کو ایمن آباد، ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہونے والے احمد بشیر نے اپنی پوری زندگی اصولوں پر ڈٹے رہ کر گزاری۔

احمد بشیر کی تعلیم ایمن آباد اور سری نگر میں ہوئی۔ ان کے والد شیخ غلام حسین ایک تعلیم یافتہ شخص تھے جنہوں نے اپنے بیٹے میں مطالعے کا شوق پیدا کیا۔ کالج کی لائبریری میں ترقی پسند مصنفین کی تحریریں پڑھنے سے ان کی فکری تشکیل ہوئی۔ احمد بشیر نے ابتدا میں شاعری کی لیکن جلد ہی نثر کو اپنا میدان بنالیا۔

ان کی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ریڈیو پاکستان سے ہوا جہاں وہ اسکرپٹ رائٹر رہے۔ بعد میں روزنامہ "امروز" سے وابستہ ہوئے اور مولانا چراغ حسن حسرت جیسے نامور صحافی کے ساتھ کام کیا۔ احمد بشیر کو پاکستان میں تحقیقاتی صحافت کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ان کا کالم "شہر سرائے" بہت مقبول ہوا جس میں موضوعاتی تنوع اور معلومات کا خزانہ تھا۔

فلم سازی میں بھی انہوں نے قدم رکھا اور **۱۹۶۹**ء میں اردو فلم "نیلا پربت" بنائی جو تجرباتی نوعیت کی تھی۔ اگرچہ یہ فلم کمرشل طور پر ناکام رہی لیکن اس نے احمد بشیر کی فنکاری کو ثابت کیا۔ ان کی ادبی خدمات میں خاکوں کا مجموعہ "جو ملے تھے راستے میں"، مضامین کا مجموعہ "خون جگر ہونے تک"، مکاتیب "خطوں میں خوشبو" اور ناول "دل بھٹکے گا" شامل ہیں۔

احمد بشیر کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی بے باکی اور صداقت تھی۔ وہ مصلحتوں کے برعکس چلتے تھے اور اپنے عقائد پر ڈٹے رہتے تھے۔ ان کی یہ جسارت ان کی تحریروں میں بھی جھلکتی ہے۔ نیلم احمد بشیر نے اپنے والد کے بارے میں لکھا: "ابا کی اپنی زندگی ایک ولولہ، ایک زلزلہ، ایک ایڈونچر تھی۔"

اس مقالے کا بنیادی مقصد احمد بشیر کی خاکہ نگاری کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ ہو گا۔ اس تحقیق میں یہ جائزہ لیا جائے گا کہ احمد بشیر نے خاکہ نگاری کے فن کو کیسے برتا، ان کا اسلوب کیا ہے، اور وہ دیگر خاکہ نگاروں سے کس طرح مختلف ہیں۔

تحقیق کا دائرہ کار احمد بشیر کی کتاب "جو ملے تھے راستے میں" تک محدود ہو گا جو یونس جاوید نے مرتب کی۔ اس میں تیرہ خاکے شامل ہیں جن میں چراغ حسن حسرت، حسرت موہانی، میرا جی، احسان دانش، ظہیر کاشمیری، ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، وارث میر، خواجہ خورشید انور، کشور ناہید، عبدالمجید بھٹی اور بریگیڈیئر عاطف کی شخصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس مطالعے میں متنی تجزیہ (Textual Analysis) کا طریقہ کار اپنایا جائے گا۔ ہر خاکے کا الگ سے جائزہ لیا جائے گا تاکہ احمد بشیر کی خاکہ نگاری کی خصوصیات واضح ہو سکیں۔ ساتھ ہی تقابلی مطالعہ بھی کیا جائے گا جس میں احمد بشیر کے خاکوں کا دیگر معروف خاکہ نگاروں جیسے مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، شاہد احمد دہلوی اور سعادت حسن منٹو کے خاکوں سے موازنہ کیا جائے گا۔

یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہو گا۔ پہلے باب میں خاکہ نگاری کی تعریف، اقسام، فنی لوازمات اور اردو میں خاکہ نگاری کی تاریخ پر روشنی ڈالی جائے گی۔ دوسرے باب میں احمد بشیر کی مکمل سوانح عمری پیش کی جائے گی جس میں ان کی ولادت، تعلیم، خاندانی پس منظر، پیشہ ورانہ زندگی اور ادبی خدمات شامل ہوں گی۔

تیسرے باب میں احمد بشیر کے تمام خاکوں کا تفصیلی تجزیہ کیا جائے گا۔ ہر خاکے کی انفرادیت، موضوع کی تصویر کشی، واقعات کا انتخاب اور فنی خوبیاں واضح کی جائیں گی۔ چوتھے باب میں احمد بشیر کے اندازِ تحریر کا جائزہ لیا جائے گا- ان کی زبان، اسلوب، حقیقت نگاری، مزاح، تنقید اور فلمائی تکنیک کا استعمال۔

پانچویں باب میں تقابلی مطالعہ پیش کیا جائے گا جس میں احمد بشیر کے خاکوں کا دیگر بڑے خاکہ نگاروں کے کام سے موازنہ کریں گے۔ اس سے احمد بشیر کی انفرادیت اور ان کا اردو خاکہ نگاری میں مقام واضح ہو گا۔ یہ تحقیق اس بات کی کوشش ہو گی کہ احمد بشیر کی خاکہ نگاری کو اس کے تمام پہلوؤں سے سمجھا جائے اور اردو ادب میں ان کی خدمات کا صحیح اعتراف کیا جائے۔

فہرست



احمد بشیر

باب اول

تعارف:

خاکہ کسی شخص کے کسی ایک پہلو یا چند پہلوؤں سے متعلق مختلف واقعات کو جمع کر کے اس کی تصویر کو محترک انداز میں پیش کرنے کا نام ہے۔

"خاکہ دراصل ایک ایسا شخص مضمون ہے جس میں کسی شخصیت کے اہم، نمایاں اور منفرد پہلوؤں کو اس طرح اجاگر کیا جائے کہ وہ شخصیت ایک جیتی جاگتی، چلی پھرتی محترک صورت میں قاری کے سامنے آجائے۔"(۱)

انگریزی میں اس صنف کے لیے سکیچ Sketch یا بن پورٹریٹ Pen Potrait کا لفظ مستعمل ہے جب کہ اردو میں اس صنف کو خاکہ، شخصی مرقع اور قلمی خاکہ بھی کہا جاتا ہے۔ دراصل شخصی مرقع بھی کسی شخصیت کی واقعات کے ساتھ ایک ایسی ہو بہو جان دار تصویر کشی ہے کہ وہ آنکھوں دیکھی معلوم ہونے لگے۔

اردو خاکہ اور اردو سوانح میں ایک بنیادی اور معمولی سا فرق ہے کہ سوانح انسان کی پیدائش اور اس کے مرنے کے وقت تک کے تمام واقعات اور زندگی کے ہر پہلو کو بہت گہرائی سے مشاہدہ کر کے جمع کرنے کا نام ہے۔ سوانح اور شخصی خاکہ میں نمایاں فرق طوالت و اختصار کا ہے۔ سوانح نگار کسی شخصیت کی پیدائش، بچپن، وارثت، آباواجداد،، تعلیم وتربیت اور دیگر سوانحی تفصیلات اہم اور غیر اہم واقعات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ شخصیت کا عہد بہ عہد ارتقا پوری وصاحت اور تفصیلات اور قطعیت کے سامنے آجاتا ہے اس کی تمام تر تفصیلات ارتقائی تصویر

کشی سوانح عمری کے دائرے میں آتی ہیں۔ سوانح کا تعلق تاریخ سے ہے سوانح نگار مورخ کی طرح واقعات کو تسلسل سے بیان کرنے کا پابند ہے۔ سوانح کا اسلوب بیانیہ و سنجیدہ ہوتا ہے اس میں مزاح وظرافت کی گنجائش نہیں ہوتی نہ ہی مورخ اپنی طرف سے کوئی بات اس میں شامل کر سکتا ہے۔ سوانح میں شخصیت کی زندگی اور اس کے نظریات، تاریخ اور ادبی پہلو کو جس قدر اجاگر کیا جائے گا اتنی ہی سوانح بے مثال ہو گی۔

جب کہ اردو خاکہ شخصیت کے کسی ایک پہلو یا چند پہلوؤں سے جڑے ہوئے واقعات کو جمع کر کے انسان / شخصیت کے چہرے، حلیے، عادات واطوار، اخلاق و کردار کو اس طرح سے پیش کیا جائے کہ اس کی شخصیت ابھر کر سامنے آجائے۔ خاکہ میں خاکہ نگار واقعات کو تاریخی تسلسل سے بیان کرنے کا پابند نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے حسن انتخاب سے ان واقعات کو پیش کرے جن سے جس شخصیت پر خاکہ لکھا جا رہا ہے۔ اس کی شخصیت پوری طرح واضح ہو جائے۔ خاکہ کا اسلوب شائستہ اور پر مزاح ہو سکتا ہے۔ خاکہ میں اسلوب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسلوب جس قدر منفرد ہو گا خاکہ اتنا ہی دلچسپ اور کامیاب ہو گا۔

خاکہ اور سوانح دونوں کا موضوع ایک خاکی انسان ہے سوانح نگار اور خاکہ نگار دونوں کا اولین مقصد اس فرد بشر کو چلتا پھرتا متحرک، جاندار صور میں پیش کرتا ہے۔ خاکہ کی طرح سوانح میں شخصیت سے ذاتی تعلق ضروری ہے۔ خاکہ اور سوانح دونوں میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی ایک عام انسان سے لے کر اہم، عظیم تر شخصیت کو موضوع بن سکتی ہے۔ خاکہ اور سوانح دونوں میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی ایک عام انسان سے لے کر اہم، عظیم تر شخصیت کو موضوع بن سکتی ہے۔ خاکہ اور سوانح نگار دونوں اپنے تخیل یا تصور سے نہیں بلکہ اس شخصیت کی تصویر کشی کرتے ہیں جو شخصیت میں موجود ہوتی ہے۔ خاکہ اور سوانح میں دونوں صورت میں اصناف، شخصیت کی

تصویر کشی کو غیر جانبدارانہ طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ خاکہ نگار اور سوانح نگار اپنی ذاتی پسند کے بغیر شخصیت کا تجزیہ و مشاہدہ کرتا ہے۔ دونوں کو ہی صداقت / سچائی اور خلوص سے حقیقت کو بیان کرنا ہوتا ہے۔ دونوں میں شخصیت کے ظاہری حالات، عادات و اطوار، میل جول کے ساتھ باطنی کیفیات کو بھی پیش کرنا ضروری ہے دونوں کا موضوع انسان ہے اور مقصد سیرت کو واضح طور پر بیان کرنا۔

خاکہ کے بارے میں مختلف ادبا کی آرا:۔

بشیر سیفی:

"خاکہ ایسا تخلیقی مضمون ہے جس میں کسی فرد کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو ذاتی حوالے سے اختصار سے ساتھ پیش کیا گیا ہو"۔(۲)

امجد کندیانی:

"خاکہ ایک تخلیقی صنف ادب ہے جس میں زندہ شخصیت گوشت پوست کا بدن لیے عظمت کی بھاری بھر کم عباؤں کو دم بھر کے لیے اتار کر روز مرہ کے لباس میں نظر آتی ہے اور ہم انہیں ویسا دیکھتے ہیں جیسا کہ سچ مچ تھے نہ کہ جیسا بننا چاہتے تھے یا جیسا ظاہر کرتے ہیں"۔(۳)

صمد طفیل:

"میرے نزدیک خاکہ نگاری خدائی حدود میں قوم رکھنے کے مترادف ہے یعنی جو کچھ آپ کو خدا نے بنایا ہو اس کے عین مین اظہار کا نام خاکہ نگاری ہے"۔(۴)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان:

"خاکہ نگاری ایک ایسی ظالم صنف ہے کہ اس میں صرف ستائشی کلمات سے بات نیں بنتی تاوقت کہ انسانی زندگی کے دونوں پہلو پیش نہ کیے جائیں موصوف کا تشخص ہو ہی نہیں سکتا"۔(۵)

امجد کندیانی اپنے مضمون "خاکہ نگاری کیا ہے؟" میں لکھتے ہیں:

"خاکہ کو تکنیک، ساخت اور دیگر فنی لوازم پورے کرنے کے علاوہ بھی تو کسی حسن کا حامل ہونا چاہئے۔ اور وہ قاری کے لیے سرور وانسباط مسرت و بہجت کا باعث ہوا اور کچھ نہ ہو تو کم از کم روحانیت کو ہلکی سی رفعت کا احساس تو ضرور ہو"۔ (۶)

انیس شاہ جیلانی:

"خاکہ کی مختصر تعریف یہ ہونی چاہیے کہ لفظوں کے سہارے کسی چلتی پھرتی شخصیت میں صفحہ قرطاس پر جان ڈال دینا یہ کوئی آسان اور معمولی کام نہیں ہے جو مشکل اور دار ورسن کی آزمائش والی بات ہے"۔(۷)

اردو خاکہ نگاری شاہد حنائی:

"خاکہ نگاری کو لفظی حوالے سے دیکھا جائے تو فارسی زبان سے ماخوذ لفظ "خاکہ" فارسی مصدر "نگارش" سے مشتق ہے"۔(۸)

اردو تنقید میں خاکہ نگاری کے نظری مباحث

خاکہ نگاری کے فن پر بات کی جائے تو سب سے پہلے یہ اہم ہے کہ خاکہ نگار جس شخصیت پر خاکہ لکھنے جارہا ہے اس کی شخصیت سے بخوبی واقف ہو اور اس سے جڑے تمام تر معاملات و واقعات پر اچھی طرح سے آگاہی ہو۔ اچھا خاکہ نگار تنقیدی بصیرت کو کام میں لاتے ہوئے ایسے واقعات یا پہلو کو اجاگر کرے جس سے خاکہ کا اجتماعی تاثر پوری طرح سے ادا ہو جائے خاکہ نگاری کے دوران شخصیت کی خوبیوں کو خامیوں کو غیر جانبدارانہ طور پر واضح کرے۔ شخصیت کی صرف خوبیوں کو بیان کر دینے یا صرف خامیوں کو کسی تعصب کی بنا پر بیان کر دینے سے خاکے کا اصل مقصد ختم ہو جاتا ہے۔ خاکہ کسی انسان کو اس کی اصل صورت میں پیش کرنے کا نام ہے۔ خاکہ خوبیوں اور خامیوں کا متوازن تخلیقی اظہار ہے۔

محمد طفیل:

"صرف عیب جوئی شخصیت نگاری نہیں اور نہ ہی عیب پوشی کا نام شخصیت نگاری ہے میرے نزدیک تو خوف خدا کے ساتھ فن کارانہ عکاسی کا نام شخصیت نگاری ہے"۔(۹)

خاکے کا مواد:

خاکہ نگار کو خاکے کے لیے جو مواد حاصل ہو سکتا ہے اس کے مختلف ذرائع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ذاتی معلومات، خطوط، شاعری، دیگر تصانیف، محاضرات، اقوال وغیرہ شخصی خاکوں میں مواد کی فراہمی کا پہلا اور اہم ذریعہ تو خود خاکہ نگار کی ذاتی معلومات ہیں۔ جو وہ شخصیت کے بارے میں رکھتا ہے۔ یعنی شخصیت کی صورت و سیرت، گفتار و کردار، عادات

واطوار واقوال وغیرہ کے متعلق واقفیت کہ وہ کس نوعیت کے ہیں یا پھر خود نوشت مواد کی فراہمی اس میں موضوع کا اپنا انکشاف ہوتا ہے۔ دوسرا ذریعہ شخصیت کے خطوط ہیں۔ خطوط کو مشرق و مغرب میں یکساں اہمیت حاصل رہی ہے۔ عرب میں پیغمبر اسلام اور خلفاء آئمہ کے خطوط کو مذہبی نقطہ نظر سے قابل قدر سمجھا گیا۔ اگر موضوع کوئی شاعر ہو تو اس کا کلام بھی خاکہ نگاری کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ شاعر کا کلام اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ خاکے کا موضوع ادیب یا مقرر ہے تو اس کی تحریریں، تصانیف اور تقریریں بھی مواد کا کام دیتی ہیں۔ خاکہ نگار جزئیات کے ذریعہ بھی مواد حاصل کرنے میں مدد لیتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ موضوع کی ہیم عصر شخصیتوں کے سوانح، خطوط اور تحریروں سے بھی مواد حاصل کرنے میں مدد لی جاسکتی ہے۔ خاکے کو موضوع عام انسان بھی ہو سکتا ہے اس میں موضوع کی کوئی قید نہیں۔

> "اسلوب کی بحث فن خاکہ نگاری سے متعلق نہیں تھی یہ متعین نہیں کیا جاسکتا کہ خاکے کا اسلوب کیسا ہونا چاہیے کیونکہ اسلوب لکھنے والے کی افتادِ طبع کا غماز ہوتا ہے اور اس کی ہر قسم کی تحریروں میں جھلکتا ہے مگر چوں کہ اردو کا پہلا کامیاب خاکہ "نذیر احمد کی کہانی شگفتہ اسلوب میں لکھا گیا ہے اس لیے بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ کاکے کا شگفتہ اسلوب میں لکھنا جانا ضروری ہے"۔(۱۰)

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> "خاکے میں لطیف مزاح اور نکتہ آفرینی ضروری ہے۔"(۱۱)

خاکہ کے فنی لوازمات:

خاکہ نگاری کی ایک اہم خوبی اختصار ہے۔ یہی وصف خاکے کو سوانح سے مختلف بناتی ہے۔ خاکہ مختصر بھی لکھا جاسکتا ہے اور طویل بھی۔ مگر یہ خاکہ نگاری کی خوبی میں شامل ہو گا اگر خاکہ نگار خاکے میں شخصیت کے تمام اہم پہلوؤں کو کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ اجاگر کرے۔ اختصار کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ خاکہ کمزور یا ادھورا ہے۔ طویل کاکے کی بجائے مختصر خاکہ زیادہ متاثر کن اور دلچسپ ہو سکتا ہے یا ہو تا ہے۔ خاکہ میں اختصار پیدا کرنا خاکہ نگار کے لیے مشکل کام ہے۔ لیکن غیر ضروری تفصیل یا طواہت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اختصار واقعات کے انتخاب اور الفاظ کے بے جا اسراف میں کرنا ضروری ہے کم الفاظ میں جامع بات زیادہ متاثر کن ہوتی ہے۔

مشاہدے کی گہرائی اور باریک بینی:

کامیاب خاکہ نگار کے لیے یہ ضروری ہے کہ شخصیت کے ظاہری اور باطن باطنی پہلوؤں کا باریک بینی سے مشاہدہ کرے۔ شخصیت کے تمام تر اہم پہلوؤں کی واضاحت ہونی چاہیے جس سے کردار کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ شخصیت کی حرکات وسکنات، چال ڈھال، اخلاق و سیرت عادت وخصائل، ذوق، مزاج اور انداز فکر معمولات زندگی غرض مکمل اور جامع بیان ہونی چاہیے جس سے قاری کو ایسا محسوس ہو کہ جیسے وہ شخصیت قاری کی آنکھوں کے سامنے ہو۔

وحدت تاثر:

کامیاب خاکے کے لیے اہم کام قاری کے ذہن میں ایک مضبوط اور واحد تاثر چھوڑنا ہے۔ خاکہ کا بنیادی عنصر اس کا تاثر ہے۔ خاکہ نگاری میں یہ اہم کمال ہے کہ خاکے میں تاثر آغاز سے آخر تک قائم رہے۔ خاکہ دراصل خاکہ نگار کے ذاتی تجربات و مشاہدات کی عکاسی کرتا ہے اس لیے کوشش یہ ہونی چاہیے کہ خاکہ نگار نے جو تاثرات خود شخصیت کے حوالے سے خود محسوس کیے ہیں وہی تاثرات قاری پر بھی واضح ہوں۔ خاکے میں تاثر واقعات کے انتخاب کے علاوہ عمدہ شگفتہ اسلوب کا مرہون مت بھی ہے۔ اگر خاکہ بہت سے غیر متعلقہ باتوں سے بھر دیا جائے تو وحدت تاثر کا عنصر ختم ہو جاتا ہے جو کہ قاری کی دلچسپی کو بھی کم کر دیتا ہے ساتھ ہی خاکہ بکھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے خاکے میں وحدت تاثر کا ہونا لازمی ہے۔

سراپا نگاری:

جب تک خاکہ نگار شخصیت کا ظاہری عکس یا حلیہ اور وضع قطع پیش نہیں کرتا قاری اس سے متعارف نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس کے بگیر کسی شخصیت کا تصور ذہن قبول نہیں کرتا یہ ایک عام سی بات ہے کہ اگر دوستی کی بنیادین جسمانی موجودگی یا عکس تصویر کیے بغیر استوار کی جائیں تو ایک گہرے دوست کے لیے دوسرے دوست کو پہنچاننا تو تو کیا یاد رکھنا بھی آسان نہیں ہوتا۔

خاکہ نگار صاحب خاکہ کی فطرت عادات واطوار کو ظاہری خدوکال کے ساتھ بیان کرتا ہے تو شخصیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ یہ بیان نہ صرف حقیقت پر مبنی ہوتا ہے بلکہ اس میں ادبی رنگ بھی شامل ہوتا ہے تاکہ قاری کے ذہن میں شخصیت کی تصویر نمایاں طور پر واضح ہو جائے۔

واقعات کا انتخاب:

خاکہ نگاری کے لیے خاکہ نگار کو شخصیت کے ایسے واقعات کا انتخاب کرنا چاہیے جس کے متعلق خاکہ نگار کو اچھی طرح سے واقفیت ہو۔ خاکہ نگار کو اپنی فنی بصیرت سے اہم نمائندہ وضروری واقعات کا انتخاب کرکے منظم انداز میں ترتیب دے کر صاحب خاکہ کی شخصیت کو اجاگر کرے۔ خاکے میں موضوع کے متعلق ہی معلومات فراہم کی جائیں غیر ضروری اور معمولی واقعات سے خاکہ غیر موثر اور شخصیت کے نکھرنے کے بجائے دھندلی ہو سکتی ہے۔

غیر جانبدارانہ رویہ / غیر جانبداری:

خاکے میں غیر جانبداری کا عنصر لازمی جز ہے۔ خاکہ نگار کو صاحب خاکہ کو پوری سچائی اور دیانتداری سے بیان کرنا چاہیے یعنی کے شخصیت کو اس کی تمام اچھائیوں اور برائیوں سمیت اجاگر کرے خاکہ میں شخصیت کو ذاتی پسندیدگی کی بنائ پر بلکل اچھائیاں بیان کرنا یا کسی تعصب یا عناد کی بناء پر بلکل برائیاں بیان کرنا خاکے کو حقیقت سے دور کر دیتا ہے۔ خاکہ نگار کو غیر جانبدارانہ پیش کرے اس کی خوبیوں، خامیوں، اچھائیون اور برائیوں، دوستیوں، دشمنیوں، محبتوں، نفرتوں، کامیابیوں، ناکامیوں کو بغیر اپنے تبصرے و تجزیے کے بیان کرے اسی طرح سے صاحب خاکہ کی جامع و مکمل شخصیت کو سامنے لا سکتا ہے / لایا جا سکتا ہے۔

اسلوب:

خاکے کی دلچسپی اور دلکشی کا انحصار کافی حد تک شگفتہ و پرکشش شائستگی اور زبان و بیان پر منحصر ہوتا ہے۔ چونکہ خاکے میں سچائی و صداقت سے کام لینا ہوتا ہے اس لیے خاکہ نگاری اس سچائی کو جس قدر اسلوب کی لطافت

وبے تکلفی سے بیان کیا جائے کہ کسی کی دال آزاری نہ ہو۔ اسلوب میں مزاح، شوخی اور برجستگی شخصیت کے بیان کو مزید دلچسپ بنادیتے ہیں لیکن یہ شگفتگی اس حد تک ہو کہ شخصیت کی توہین نہ ہو۔ خاکہ نگار محتاط اندازو بیان سے صاحب خاکہ کی شخصیت کو اجاگر کرے ساتھ اس بات کا احساس / خیال رکھے کہ اس کے قلم وزبان وتحریر سے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر

کی بات جس سے اس نے شکایت ضرور کی

خاکہ کی اقسام:

ا۔ سوانحی خاکے: (Biographical Sketch)

سوانحی خاکہ، شخصیت کی زندگی کے واقعات، کامیابیوں، ناکامیوں، نجی و خاندانی حالات، تاریخ پیدائش، مقام پیدائش اور دیگر حالات وواقعات، شجرہ ونسب کو جزئیات سے پش کیا جاتا ہے سوانحی خاکوں میں سوانح عمری کے فنی خصائص بہت نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ سوانح حیات سے مختصر ہوتا ہے اور صرف نمایاں پہلوؤں پر توجہ دیتا ہے۔ تاکہ شخصیت کی مکمل تصویر ابھرے۔ سوانحی خاکہ حقائق پر مبنی ہوتا ہے اس میں ایجاز، تاریخی درستگی اور واقعات تسلسل شامل ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا کاکہ "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" کا پہلا سوانحی خاکہ قرار دیا جاتا ہے۔

۲۔ تاثراتی خاکہ: (Impressionistic Sketch)

مصنف کے ذاتی تاثرات، مشاہدات اور احساسات و جذبات پر مبنی، جو حقیقت کو ذاتی نقطہ نظر سے پیش کرتا ہے۔ ایسے خاکوں میں غیر جانب دار رویے کی عدم موجودگی ہوتی ہے۔ خاکے میں تاثرات متعدل اور حقیقت پر مبنی ہونے چاہیں۔

۳۔ تعارفی و سر سری خاکہ: (Introductory and Superficial Sketch)

تعارفی یا سر سری خاکہ ایک ایسی قسم جس میں شخصیت کے ظاہری خود خال اس کا حلیہ وضع قطع، پیشہ، عہدہ اور بنیادی خدو خال ظاہری شکل یا چند نمایاں خصوصیات کو قاری کے سامنے سر سری متعارف کروائے / بیان کرے۔ بغیر کسی گہرے تجزیے یا نفسیاتی گہرائی کے یہ خاکہ مختصر ہوتا ہے اور عموماً مشاہدات سر سری مشاہدات یا ابتدائی تعارف پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کی خصوصیت اختصار اور سادگی ہے۔

ممتاز مفتی کی تکاب "گردراہ" میں شامل خاکہ " میں اور میرا دوست " جہاں ایک عام دوست کی سطحی تصویر کشی کی گئی ہے۔

۴۔ مدحیہ توصیفی(Eulogistic and Descriptive Sketch)

یہ خاکے کی ایک ایسی قسم ہے جس میں شخصیت کا مثبت پہلو دکھایا جاتا ہے۔ مکمل خاکہ وہ ہوتا جس میں شخصیت کو پوری طرح منفی و مثبت پہلوؤں کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کیا جائے لیکن مدحیہ و توصیفی خاک میں شخصیت کی تعریف و توصیف، ظاہری و باطنی خوبیوں اور کامیوبیوں کو تعریف آمیز انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔

۵۔ معلوماتی خاکہ:(Informational Sketch)

معلوماتی خاکے میں شخصیت کے متعلق حقائق پر مبنی معلومات ، واقعات وحالات کو تحقیقی طور پر قاری کے سامنے پیش کی جاتا ہے۔ شخصیت کے کارنامے کردار یا پیشہ وارانہ زندگی کو معلوماتی طور پر خاکے میں بیان کیا جاتا ہے۔

٦۔ اجتماعی خاکہ(Collective Sketch)

یہ خاکے کی ایک ایسی قسم ہے جس میں خاکے ایک شخصیت پر لکھنے کے ساتھ دیگر افراد، یا گروہ یا جماعت کو خاکے میں لایا جاتا ہے یعنی ایک فرد کے ساتھ دیگر افراد کی مشترکہ خصوصیات کو بیان کیا جاتا ہے۔ یہ خاکہ انفرادی خاکہ سے مختلف ہوتا ہے کیونکہ اس کا دائرہ کار وسیع ہوتا ہے اس میں اجتماعی تصویر کشی پر زور دیا جاتا ہے۔ مرزا ادیب ، ممتاز مفتی اور فارغ بخاری کے خاکو میں اس قسم کے خاکوں کی مثالین ملتی ہیں۔

۷۔ تقریباتی خاکے:(Ceremonial Sketch)

تقریباتی خاکے میں کسی خاص موقع تقریب یا واقعے سے متعلق شخصیت کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ بعض اوقات کسی شاعر ادیب یا فن کار کی کسی کتاب یا فن پارے کی رونمائی کی تقریب یا کسی دیگر تقریب میں بعض حضرات ان کے فن اور شخصیت پر مضامین پڑھتے ہیں ان میں اکثر مضامین شخصی نوعیت کے ہوتے ہیں ان میں شخصیت کے کردار اور حالات وواقعات کو سنجیدگی کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

اردو میں خاکہ نگاری کا تاریخی جائزہ

اردو میں خاکہ نگاری کے اولین نقوش:

جب اردو میں باضابطہ شعر گوئی کا رواج ہوا تو مشاعرے ترتیب دیئے جانے لگے اور پھر اہل ذوق نے بیاضوں میں اپنی اپنی پسند کے اشعار لکھنے شروع کیے۔ بعض لکھنے والوں نے منتخب اشعار کے ساتھ شاعر کا نام بھی لکھ دیا اور اس کے کچھ حالات بھی درج کر دیئے۔ اس طرح تذکرہ نگاری کی ابتداء ہوئی۔ چونکہ اردو شاعری کے رواج ے کافی عرصہ بعد تک بھی تصنیف و تالیف کی زبان فارسی ہے۔ میر کے نکات شعراء ۱۱۶۵ء میں لکھا گیا۔ نکات اشعراء اور اس کے بعد کے تذکروں میں خاکہ نگاری کے اولین ہلکے پھلکے نقش ملتے ہیں۔ لیکن یہ نقوش اتنے مکمل نہیں ہیں کہ ہم انہیں خاکہ کہہ سکیں۔ نکات الشعراء میں میر نے موضوع کی سیرت و کردار کو واضع کیا ہے۔ بعض تذکروں میں شاعروں کے متعلق نسبتاً زیادہ تفصیل سے معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ جسے قدرت اللہ قاسم کا مجموعہ "نِفر" (۱۲۱۲ء) یا سعادت یار خاں کا تذکرہ "خوش معرکہ زیبا" وغیرہ میں قاسم اور سعادت یار خاں نے شاعروں سے متعلق تمام معلومات یک جاکر دیئے ہیں جو ان کے علم میں تھے۔ لیکن باوجود تفصیل کے شاعر کی پوری شخصیت ہمارے سامنے نہیں آتی۔ ان تذکرہ نگاروں کی نامکمل خاکہ نما تحریروں کو ہم خاکہ کا عکس ضرور کہہ سکتے ہیں لیکن کاکہ کی شرائط کی عدم موجودگی کے سبب اس کو خاکہ کی صنف میں شمار نہیں کر سکتے۔

تذکروں کے بعد انشا کی "دریائے لطافت" میں کردار نگاری کی جھلکیاں واضح ملتی ہیں۔ انشا نے میر ظفر عینی، بھاڑامل، مرزا صدالدین اصفہانی اور ملّا عبدالفرقان کی کامیاب تصویریں اتاری ہیں۔ لیکن ان میں حلیہ اور ہیئت نگاری زیادہ اور شخصی فطرت کی عکاسی کم ہے ان کے اپنے تاثرات کی کمی کا احساس بھی ہوتا ہے جس کے سبب ان کے

پیش کردہ خاکے (Proto Type) خاکے کہے جاسکتے ہیں۔ خاکوں کی جھلک "محبوب الزمن" اور "تذکرہ گل رعنا" میں بھی کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔ لیکن آزاد کی " دربار اکبری" "نیرنگ خیال" اور "آب حیات" میں بعض معلومات ایسے انداز میں فراہم کی گئی ہیں کہ یہ قلمی تصویریں خاکے سے بہت قریب نظر آنے لگتی ہیں۔

محمد حسین آزاد پہلے تذکرہ نگار ہین جنہوں نے مختلف افراد کا حلیہ، عادات واطوار، نظریات وعقائد، ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ پوری شخصیت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ کرنل ہالر آیند کی ایما پر محمد حسین آزاد نے چند تمثیلی انشایئے لکھے تھے ان مضامین میں بھی کہیں کہیں خاکہ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا مضمون "شہرتِ عام' اور "بقائے دوام کا دربار" پیش کیا جاسکتا ہے۔ محمد حسین آزاد کی مشہور تصنیف "دربار اکبری" میں بھی خاکہ نگاری کی کچھ جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ اس میں بھی ہم کو فضائل و عادات، حلیہ نگاری اور کردار نگاری کے اچھے نمونے مل جاتے ہیں۔ محمد حسین کی آزاد کی کتاب "آب حیات" میں پیش کردہ شخصی تصویروں کو خاکوں کے واضح نمونے کہہ سکتے ہیں۔ان کی تحریوں کے آئینے میں آب حیات کا عکس کچھ اس طرح منعکس ہے:

تاریخ میں واقعات زمانہ سے بحث کی جاتی ہے اور تذکرہ میں اشخاص کا بیان ہوتا ہے۔ "آب حیات" میں تاریخ اور تذکروں دونوں کی خصوصیات یکجا ہوگئی ہیں اور چونکہ اس میں ولی سے غالب تک تقریباً تمام مشاہیر شعراء کے حالات درج ہیں اس لیے یہ مختصر سوانح کے زمرے میں بھی آتی ہے۔

محمد حسین آزاد اور جانسن دونوں نے تذکرہ نگاری کا ایک ہی طریقہ کار اختیار کیا دونوں کے اسالیب تحریر میں بھی بڑی مماثلت نظر آتی ہے۔ رسوا اور شرر نے ان کی رکھی ہوئی بنیادوں پر اس صنف کی عمارت کھڑی کرنے کی کوشش

میں نمایاں حصہ ادا کیا ہے۔ شرر نے "سید رجال ونسوان" کے علاوہ چیدہ شخصیتوں کے تین اہم سلسلہ بھی لکھے ہیں۔ ان میں بھی شخص مرقعوں کے زیادہ واضح نمونے ملتے ہیں۔ شرر کے بعد مرزا محمد ہادی رسوا نے "وضع داران لکھنو" کے نام سے شخصیتوں پر مضامین کا مجموعہ شائع کیا۔ رسوا کے بعد خواجہ حسن نظامی نے دلی کی اکثر ٹمری شخصیتوں کی تصویر کشی کی۔ جنہیں وہ قلمی چہرے کہا کرتے تھے۔ لیکن ان کی تصاویر میں شخصیت کی مکمل عکاسی نہیں انہیں صرف حلیہ کہہ سکتے ہیں اور انہی کو انہوں نے بہت ذیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے البتہ "محرم نامہ" میں کربلا سے متعلق مختلف شخصیتوں کے حلیے ان کی سیرت کے نقوش اور متعلقہ واقعات کو اپنے منفرد اسلوب میں پیش کیا ہے۔ آزاد، عبدالحلیم شرر، رسوا، خواجہ حسن نظامی کی متذکرہ بالا تخلیقات کو اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں بنیادی اہمیت حاصل رہے گی مکمل خاکے یقیناً ان تخلیقات میں نہیں ملتے لیکن یہ تخلیقات خاکہ نگاری کے کامیاب نقوش کی حیثیت کی حامل ہیں۔ تذکروں میں شخصیات کی جو جھلکیاں خاکوں سے ملتی جلتی ہیں ان کو لکھتے وقت شخصیت نگاری کے فنی اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ ایجاز و اختصار کے ساتھ شخصیت کو پیش کیا گیا ہے۔ تذکرہ نگار چند الفاظ یا فقروں کے ذریعے شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی جانب اشارہ کر کے آگے بڑھ گئے ہیں

۸۔ اردو میں خاکہ نگاری کا ارتقاء:

اردو میں خاکہ نگاری کے اولین نقوش محمد حسین آزاد کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ پھر عبدالحلیم شرر، رسوا، خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں خاکہ نگاری کے ایسے نمونے ملتے ہیں جنہیں Proto Type Sketches خاکوں سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ اردو میں جدید خاکہ نگاری کی ابتداء مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکوں سے ہوتی۔

فرحت اللہ بیگ بھی بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں شخصی خاکوں کی طرف رجحان ہوا اور شخصی خاکہ نگاری کو ایک مستقل صنف کا درجہ دیا۔ "نذیر احمد کی کہانی" اردو ادب کا ایک گراں قدر تخلیقی کارنامہ ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے اردو میں خاکہ نگاری کی ایک نئی روایت کا آغاز کیا۔ اس سے پہلے خاکہ نگاری کا کوئی مکمل نمونہ موجود نہیں تھا۔ "نذیر احمد کی کہانی" کے بعد فرحت اللہ بیگ نے خاکہ کی صنف میں کئی تخلیقات پیش کیں۔ "نذیر احمد کہانی" منظر عام پر آنے کے بعد کئی مصنفین نے اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ ۱۹۲۹ء آل انڈیا ریڈیو دہلی سے چند مضامین نشر کئے گئے جو راشد الخیری، ڈپٹی نذیر احمد، چکبست اور داغ کی شخصیتوں سے متعلق تھے۔

آغا حیدر حسین نے مختلف شخصیتوں پر کئی خاکے لکھے ان میں سے بعض خاکے ان کے مجموعہ مضامین "پس پردہ" میں شامل ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ یہ مضامین مکمل قلمی تصویریں ہیں اس زمانے میں مولوی عبد الحق، خواجہ محمد شفیع دہلوی، عبد الرزاق کانپوری، عبد الماجد دریا آبادی اور رشید احمد صدیقی نے بھی شخصی خاکے لکھے۔

مولوی عبد الحق کے خاکوں کا مجموعہ "چند اہم عصر" کے نام سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا انہوں نے دوسری شخصیات کو اپنی خود بینی خود نمائی کا ذریعہ نہیں بننے دیا بلکہ ان کے خاکے خارجی نقطہ نظر اور معروضیت کی وجہ سے ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔

محمد شفیع دہلوی کی کتاب "دلی کی سنبھال" ۱۹۳۸ء میں منظر عام پر آئی۔ اس میں پرانی والی کا نشقشہ کھینچا ہے۔ اس نقشے میں دلی والے او کچھ دلی والون کی زندہ محترک تصویریں پیش کی ہیں۔ انہوں نے مختلف قسم کی شخصیات پر خاکے لکھے۔ ممتاز حسین کا علامہ اقبال کے بارے میں لکھا ہوا خاکہ ارتقاء کی طرف ایک اور قدم بڑھاتا ہے۔

بشیر احمد ہاشمی کی کتاب "گفت وشنید" ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں چند پیشہ ور شخصیات عمومی خصوصیات کے ساتھ خاکے لکھے گئے ہیں ان کی کتاب سے خاکہ نگاری کے امکانات میں اضافہ ہو گیا ہے۔

خواجہ غلام السیدین کا "آندھی میں چراغ" سترہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان شخصیات میں گاندھی جی، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر اقبال، سید راس مسعود، خواجہ غلام الثقلین، محبانی خاتون اور سیدہ خاتون وغیرہ شامل ہیں۔

عبدالرزاق کانپوری کی کتاب "ابرامکہ" کے نام سے شائع ہوتی، انہوں نے اردو ادب کی صنف خاکہ میں اتنا سرمایہ چھوڑا ہے کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے سترہ شخصیات کے خاکے لکھے جن میں سرسید، شبلی، جسٹس امیر علی، محسن الملک، رحمت اللہ، سید محمود، شرر، ذکااللہ، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، حالی، اکبر، وقارالملک، رحمت اللہ، سید محمود، شرر، سلیم، سید جعفر حسین لکھنوی، میر ناصر علی، اور راس مسعود شامل ہیں۔ یہ مضامین راس کی فرمائش پر لکھے گئے تھے جو کتابی صورت میں "یادایام" کے نام سے ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔

عبدالماجد دریابادی اپنے وقت کے ایک اہم خاکہ نگار ہیں۔ عبدالماجد نے کئی خاکے لکھے۔ جن میں مہدی افادی، اکبر الٰہ آبادی اور شبلی کے خاکے قابل ذکر ہیں۔ خاکہ نگاری کے میدان میں ان کا نمایاں کارنامہ "محمد علی" کے نام سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا ہے۔ بعض ناقدین نے اسے طویل خاکہ قرار دیا ہے۔

شخصی خاکے کے فن میں رشید احمد صدیقی کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے شخصی خاکوں کے مجموعے "گنج ہائے گراں مایہ" کے نام سے ۱۹۳۷ء۔ ہم نفسانِ رفتہ ۱۹۴۴ء(۱۱) اور "خنداں" ہیں۔ ان کے علاوہ "آشفتہ بیانی میری" "شیخ نیازی" اور "مضامین رشید" میں بھی ان کی خاکہ نگاری کے نمونے مل جاتے ہیں۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اردو ادب کئی نئے رجحانات و تحریکات سے اثر پذیر ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک نے ادب کو خاص رخ دینے کی کوشش کی۔

خاکون کے سلسلے کا آغاز ۱۹۲۸ء میں ہوا۔ جس میں کرشن چندر، سردار جعفری، عصمت چغتائی اور ساحر لدھیانوی نے عرا ترتیب سعادت حسین منٹو، مخدوم محی الدین مجاز اور دیوبندر کی شخصیتوں پر خاکے لکھے تھے۔ مخدوم محی الدین کا خاکہ جو سردار جعفری نے لکھے ہے شخصیت نگاری کے حوالے سے اتنا جاندار نہیں۔ ساحر کے خاکے میں جو کہ کیفی اعظمی نے لکھا ہے شخصیت کا ایک رومانی تصور جھلکتا ہے۔ ساحر نے خاکہ نگاری کے اصولوں کو احتیاط سے برتنے کی کوشش کی ہے۔

سعادت حسین منٹو اور عصمت چغتائی بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ عصمت نے "مجاز" کے بعد ایک خاکہ "دوزخی" لکھا۔ دوزخی کا شمار اردو ادب کے چند مفرد خاکوں میں ہوتا ہے۔

منٹو کے شخصی خاکوں کے تین مجموعے "گنجے فرشتے" ۱۹۵۲ء میں اور "لاوڈ اسپیکر" ۱۹۵۵ء میں، اور "قلمی شخصیتیں" ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئے۔ منٹو نے شخصی خاکے کو انشائیے کی حدود سے نکال کر افسانے کے قریب پہنچادیا۔ منٹو کے مففرد انداز اور کامیاب تجربہ خاکے کے لیے نئی چیز ہے اور اس صنف میں ان کی فن کاری نئے رجحانات کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس دور میں بعض ایسے خاکہ نگار بھی شامل ہیں جن کا ترقی پسند تحریک سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ چند قابل ذکر نام درج ہیں۔

اشرف صبوحی، سردار دیوان سنگھ مفتون، شوکت تھانوی، مالک رام، تمکین کاظمی، غلام احمد، فرقت کاکوروی، رئیس احمد جعفری، اعجاز حسین اور چراغ حسن حسرت وغیرہ۔

انگریزی ادب میں خاکہ نگاری:

خاکہ نگاری کی جڑیں مغربی ادب میں ملتی ہیں۔ انگریزی ادب میں خاکہ نگاری کا آغاز سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں ہوا۔ جو قدیم یونانی مصنف تھیوفراس توس کے Characters سے متاثر ہیں۔ جن میں شخصیتی تصیویر کرشی کی گئی تھی۔ انگریزی ادب میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش جاسر کی مشہور تصنیف (Canterbury tales) میں ملتے ہیں چاسر نے مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو اپنا موضوع بنایا۔ اٹھارہویں صدی میں رسالوں کے عروج نے خاکہ نگاری کو فروغ دیا۔ جو زف اڈیسن اور رچرڈ اسٹیل نے اپنے رسالوں (۱۷۰۹۔۱۷۱۱ء) The Taller اور ۱۷۱۱ تا ۱۷۱۲ء The Spectator کے ذریعے کرداروں کو لفظی جامہ پہنایا۔ انگریزی ادب میں جانسن نے خاکہ نگاری کی صنف میں اضافہ کیا۔ انسیویں صدی میں خاکہ نگاری کی صنف کا دائرہ کار وسیع ہوا جس میں Charles Lamb نے (۱۸۲۳-۱۸۲۰ء) Essay of Elia میں خود نوشت عناصر کے ساتھ کرداروں کے خاکے پیش کیے۔ مشہور ادیب اے جی گارڈز نے " آن آف ڈپلو" کے نام سے Daily News میں شخصی اور کرداری خاکوں کا سلسلہ شروع کیا۔ بیسویں صدی میں سوانح اور شخصیت نگاری میں ایک نیا موڑ پیدا ہوا۔ ورنینیا وولف اور ای۔ بی۔ وائٹ جیسے مصنفین نے اپنے مضامین اور خاکوں میں طبع آزمائی کی۔ اسٹریچی کے آخری ایام میں جو خاکے لکھے اس وقت خاکہ نگاری اپنے عروج پر ہے۔ اس میں خاکہ نگاری کے اصول واضح ملتے ہیں۔

اردو میں ابتدائی نقوش انیسویں صدی میں تذکوں سے ہوا، فارسی تذکروں سے متاثر ہو کر اردو تذکروں میں شخصیت کی تصیور کشی کے عناصر شامل ہوئے۔ میر کے نکات الشعرائ ۱۱۶۵ء کو اردو کا پہلا تزکرہ مانا جاتا ہے۔ جبکہ محمد حسین آزاد کی آب حیات میں خاکہ نگاری کے واضح نمونہ ملتے ہیں۔

حواشی:

۱۔ اردو خاکہ نگاری: شاہد حنائی، ص ۱۱

۲۔ ایضا، ص، ۱۲

۳۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری۔ ڈاکٹر صابرہ سعید، ص ۱۷ تا ۱۸

۴۔ اردو کاکہ نگاری۔ شاہد حنائی، ص ۶۳

۵۔ نقوش، مئی ۱۹۵۹، ص، ۷۵

۶۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری: صابرہ سعید، ص ۱۴۷

۷۔ ایضا۔ ص، ۱۵۱

۸۔ ایضا، ص ۱۴۶

۹۔ ایضاً، ص ۱۴۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۶۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۶۴

باب دوم

سوانح عمری

ولادت:

"احمد بشیر ۲۶، دسمبر ۱۹۲۳ء میں ایمن آباد ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ غلام حسین نے ان کا نام شیخ بشیر حسین رکھا۔ جب انہوں نے اوائل جوانی میں شاعری شروع کی تو اپنا نام بشیر رومانی رکھا۔ مگر شاعری ان کے مافی القمیر کی ادائیگی مین ان کا ساتھ نہ دے پائی۔ پھر انہوں نے اپنا نام احمد بشیر رکھ لیا(اور پھر اسی نام سے معروف ہوئے)۔ احمد بشیر کل پانچ بہن بھائی بہ ترتیب احمد بشیر، اختر عکسی، ثریا، پروین (بیگم پروین عاطف) اور فرخ جمیل تھے"۔(۱)

تعارف:

سخت جان، جاہ وجلال، ضدی، بے باک اور نڈر احمد بشیر نے اپنی تمام زندگی ہمت و دلیری کے ساتھ گزاری۔ وہ دنیا کے لیے غصیلے، صاف گو اور بے باک انسان تھے لیکن اپنی اولاد کے لیے نہایت شفیق، رحم دل اور ایک مضبوط سہارا تھے۔ احمد بشیر نے اپنی چاروں بیٹیوں کو بیٹوں کی طرح پالا بلکہ ہر کام میں ان کا حوصلہ بڑھایا۔ احمد بشیر نے اپنی اہلیہ کو جو کہ سیدھی سادی گھریلو خاتون تھیں انہیں بھی کلاسیکی موسیقی کی تعلیم دلوائی۔ احمد بشیر کا اپنے داماد عباس سے خاصا اچھا تعلق تھا۔ وہ ان کے لیے بیٹے جیسا تھا۔ عباس نے اپنے سسر کی خدمت کی اور ان کے دل میں اپنی جگہ بنالی۔ نیلم احمد بشیر ابابیامیں لکھتی ہیں:

"عباس نے اپنے انوکھے سسر کو ہمیشہ اپنی ذاتی ملکیت سمجھا۔ اس لیے اس سے زیادہ ابا کی صحت اور خیریت کی فکر کسے ہو سکتی تھی؟ اس نے ابا کی ہمیشہ ایسی ہی خدمت اور کیئر کی جیسے کوئی مرشد اپنے پیر اور عاشق اپنے محبوب کی کرتا ہے"۔(۲)

احمد بشیر نے جس شخصیت پر بھی لکھا پہلے اس کا مشاہدہ کیا اور پھر معلومات کئے بعد شخصیت کو اس طرح سے کاغذ پر اتارا کہ پڑھنے والے تک اس شخصیت کے اس پہلو کی مکمل تصویر ظاہر ہو جائے۔ انہوں نے بے باک انداز میں لکھا اور بڑی دلیری سے زندگی گزاری۔ نیلم احمد بشیر اپنے مضمون ابا پیا میں لکھتی ہیں۔

"ابا کی اپنی زندگی ایک ولولہ، ایک زلزلہ، ایک ایڈونچر تھی۔ وہ جو چاہتے کر گزرتے اور دلیری سے کرتے۔ مصلحتوں کے برعکس چلنا، زندگی کی آخری سانس تک اپنے عقائد پہ ڈٹے رہنا کون نارمل آدمی افورڈ کر سکتا ہے مگر ابا نے کیا اور ڈنکے کی چوٹ پر کیا"۔(۳)

احمد بشیر کی شخصیت کا یہ پہلو ان کی مکمل زندگی کو ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے صحافت میں کام کیا ہو یا ادبی خدمات سر انجام دی ہوں ہر محاذ زندگی پہ بہادری سے ڈٹے رہے۔ احمد بشیر کے کبھی دولت و شہرت کی لالچ نہیں کی۔ ساری زندگی سادگی سے گزاری دنیاوی اشیاء کے خواہشمند نہ تھے اور نہ ہی جائیداا اور دولت جمع کی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو ہمیشہ ساتھ دیکھنا چاہتے تھے تاکہ ان میں اتحاد رہے۔

بقول نیلم احمد بشیر، احمد بشیر نے آخری ایام میں اپنی ساری اولاد کو اپنے سرہانے کھڑے دیکھ کر کہا:

"میں نے جائیداد نہیں بنائی۔ اس لیے تم سب یکجا ہو۔ اگر میری کچھ ملکیت ہوتی، تو تم اس کے بٹوارے کے جھگڑے میں پڑ کر یوں میرے پاس اکھٹے اور متحد نہ ہوتے"۔(۴)

تعلیم:

احمد بشیر نے ابتدائی تعلیم ایمن آباد میں حاصل کی۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ میں ٹاٹوں پر بیٹھ کر پڑھا ہوا ہوں۔ کیونکہ والد کا تعلق شعبہ تعلیم سے تھا اس لیے اسکول کے بعد گھر آکر بھی تعلیم کا سلسلہ اسی طرح جاری رہتا۔ موجودہ گورنمنٹ اسلامیہ ہائیر سیکنڈری اسکول اور اس وقت کا اسلامیہ ہائی اسکول احمد بشیر کی اولین درسگاہ تھی۔ مقامی سیاست میں سیاسی دھڑے بندیوں کے باعث اس اسکول سے ان کے والد کی ملازمت ختم ہو گئی۔ ۱۹۳۸ء میں والد کو سری نگر سکول میں ہیڈ ماسٹر کی نوکری مل گئی اور وہ سیر نگر چلے گئے۔ جس کے بعد سارا گھرانہ ایمن آباد سے سری نگر منتقل ہو گیا۔

احمد بشیر کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے والد کو مطالعے کا بہت شوق تھا چنانچہ انہوں نے مطالعے کا شوق اپنے گھر کے ماحول سے پایا۔ مطالعے کے علاوہ وہ انہیں کھیلوں میں کرکٹ کا بے حد شوق تھا۔ انہوں نے کالج کی لائبریری سے کتب لے کر جو پڑھنا شروع کیں تو سب کتابیں پڑھ ڈالیں ۔ ان میں مختلف موضوعات مثلاً تواریخ عالم اور خاص طور پر ترقی پسند مصنفین کی کتب شامل تھیں۔ اس مطالعے نے ان کے ذہن افق اور فکری جہتوں کا تعین کرنے میں بری رہنمائی کی کالج کی لائبریری میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریریں پڑھنے سے ان کے خیالات پر گہرا اثر پڑا۔ جو ان کی زندگی کی سمت متعین کرنے میں اہم ثابت ہوا۔

بقول طاہر اصغر:

> احمد بشیر نے ابتدارئی تعلیم ایمن آباد میں حاصل کی جبکہ میٹرک کشمیر کے ایک اسکول سے
> پاس کرنے کے بعد بی اے سری پرتاب کالج سری نگر سے کیا۔(۵)۔

۲۳مارچ 2005 کو آپ کو ملنے والے حسن کارکردگی کے اعزاز کے ساتھ بچاس ہزار کی رقم بھی تھی اور ساتھ جو سرٹیفکیٹ ہے۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

جناب احمد بشیر نے سرامر سنگھ کالج سری نگر سے گریجویشن کی۔(۶)

بقول طاہر اصغر:

احمد بشیر ۲۴مارچ ۱۹۲۳ء کو ایمن آباد میں ماسٹر غلام حسین کے گھر پیدا ہوئے۔(۷)

والدین:

احمد بشیر کے والد کا نام شیخ غلام حسین تھا۔ والدہ کا نام ممتاز بیگم تھا جو شیخ غلام حسین کی قریبی عزیزہ تھیں آپ کے والد اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ انہوں نے ایف سی کالج لاہور سے تاریخ میں ایم اے کیا تھا علاوہ ازیں وہ ایم اے فارسی بھی تھے انہیں مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ بقول احمد بشیر۔

"میرے والد صاحب کا روزانہ آٹھ گھنٹے پڑھنے کا معمول تھا۔ وہ اکنز روہٹو آدمی تھے ان کا میری زندگی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بہت پڑھے لکھے آدمی تھے مگر میں نے گھر سے سوائے ذوق مطالعہ کے کچھ حاصل نہیں کیا۔(۸)

احمد بشیر کے والد صاحب کے متعلق ممتاز مفتی اپنے خاکہ غنڈہ میں لکھتے ہیں:

"احمد بشیر کے والد خوش شکل اور ایمن آباد کی روایت سے ہٹ کر تعلیم یافتہ جوان تھے۔ ان کا حسن سنگِ مرمر کا سا تھا۔ ٹھنڈا جمال، اول تو ان میں آگ تھی ہی نہیں۔ تھی بھی تو جگنو سی ٹھنڈی آگ۔۔ قدرت کا اصول ہے کہ ٹھنڈی مٹی سے بنے ہوئے افراد صراطِ مستقیم میں پناہ لیتے ہیں۔ اپنی کمی کو

چھپانے کے لیے دوسروں کو نصیحتیں کرنے کا شغل اپنا لیتے تھے۔ شیخ غلام حسین کا صراط مستقیم ان اجزا کا بنا ہوا تھا جو ایمن آباد کی شیخ برادری کا اوڑھنا بچھونا تھا۔(۹)

احمد بشیر کی والدہ ایک گھریلو خاتون تھیں اور گھرداری کے تمام اسرار و موز کی شناسا تھیں اور رکھ رکھاؤ کے تمام آداب جانتی تھیں۔ احمد بشیر کی والدہ کے حوالے سے ممتاز مفتی لکھتے ہیں۔

احمد بشیر کی والدہ جگنو نہیں بلکہ دیپک تھیں۔(۱۰)

والدین سے احمد بشیر کے تعلقات کے حوالے سے ممتاز مفتی لکھتے ہیں۔

"برادری، رسم، ناک اور پیسہ، باپ بیٹے کا تضاد بنیادی تھا۔ باپ کی نصیحتیں کرنے کے جنون نے اسے ہوا دی اور شرارہ؟؟؟؟بن گیا"۔(۱۱)

بہن بھائی:

احمد بشیر پانچ بہن بھائی تھے ۔ ان کی ایک بہن پروین عاطف تھیں، جو اردو اور پنجابی کی ممتاز ادیبہ اور سفر نامہ نگار تھیں۔ سب سے بڑے احمد بشیر تھے اور ان سے چھوٹے اختر عسکی تھے۔ اختر سے چھوٹی بہن کا نام ثریا تھا جن کی شادی سیالکوٹ میں ہوئی تھی چھوتھی پروین عاطف ہیں جو معروف افسانہ نگار اور سفر نامہ نگار ہیں ان کی قریب چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پانچویں اور آخری نمبر پر احمد بشیر کے سب سے چھوٹے بھائی فرخ جمیل کا نام آتا ہے۔ جو معذور تھے اور فالج کی وجہ سے چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھے۔

شادی:

"احمد بشیر ازدواجی سفر آغاز کرنے سے پہلے محمودہ بیگم کو اپنے پہلے خط میں لکھا تھا"۔(۱۲)

تم پریشان نہ ہو میری زندگی میں تم ایک قندیل کر طرح ہوا۔ میں اسے کبھی بجھنے نہیں دوں گا۔

(۱۴)

خط کے نیچے لکھا تھا تمہارا احمد بشیر۔ احمد کی شخصیت کے باب میں یہ خط ان کی شخصیت کے اس پہلو کو اجاگر کرتا ہے کہ وہ دھن کے پکے تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محمودہ بیگم ان کی زندگی میں قندل کی طرح جلتی رہی، روشنی کرتی رہیں(۱۵)

اولاد:

احمد بیشر کو اللہ تعالیٰ نے چار بیٹیوں (نیلم، سنبل، بشریٰ، فلزم) اور ایک بیٹے (ہمایوں شیخ) سے نوازا۔ احمد بشیر اپنی بیٹیوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ انہیں مکمل آزادی دی۔ میاں بیوی میں پیار اور بیوی میں خاوند کی اطاعت اور اس پر بھروسہ مثالی تھا۔ اولاد پر کبھی اپنی پسند عائد نہیں کی۔ جب بیٹیوں کی شادی کی باری آئی تو ان کی شادیاں بڑی سادگی سے مسنون طریقے سے کیں۔

نیلم احمد بشیر:

نیلم احمد بشیر اردو اور پنجابی کی نامور افسانہ نگار اور دو پنجابی کی شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔ ان کے افسانوں کے پانچ مجموعے، جگنوں کے قافلے، ستمگر ستمبر، ایک تھی ملکہ، لے سانس بھی آہستہ، وحشت ہی سہی اور خاکوں کا مجموعہ چار

چاند زیور ضبع سے آراستہ ہو چکے ہیں ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے سب شادی شدہ اور امریکہ میں مقیم ہیں۔ نیلم احمد بشیر اپنے ابا کی قلمی، علمی اور فکری وارث ہیں۔ ان کی تحریروں میں بھی اپنے ابا کا رنگ جھلکتا ہے۔

سنبل شاہد:

سنبل شاہد گلوکارہ اور اداکارہ تھیں۔ ٹی وی پروگراموں کی اینکر بھی تھی۔ ان کے میاں شاہد ریٹائرڈ آرمی آفیسر ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ سنبل شاہد کے بیٹے شہراز ناصر چترال میں پیراگلائیڈنگ کرتے ہوئے حادثے کا شکار ہونے کے بعد ۲۰۱۹ء میں ہلاک ہوگئے۔ سنبل شاہد نے مختلف پاکستانی ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے سنبل شاہد ٦ مئی ۲۰۲۱ء کو کروناوائرس کے باعث لاہور میں انتقال کر گئیں۔

بشریٰ انصاری:

بشیر انصاری پاکستان ٹیلویژن کی مقبول اداکارہ، گلوکارہ، میزبان اور پروڈیوسر ہیں۔ شوخ وچنچل باتونی گوپی کو احمد بشیر پیار سے میری طوطی کہا کرتے تھے۔ بشریٰ انصاری کے دو بیٹے (مہرا انصاری، نرمان انصاری) ہیں۔ بشریٰ انصاری نے ٹیلی فلمیں، ڈرامے فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دیکھائے۔ بشریٰ انصاری کو ہم خواتین لیڈر ایوارڈ کی طرف سے پاکستانی ستارہ خواتین، ۲۰۲۰ءمیں ستارہ امتیاز، ۲۳ مارچ ۲۰۲۱ کو صدر پاکستان کی طرف سے سالانہ سول ایڈارڈز کے دوران آرٹس میں شعبہ میں خدمات کے سلسلے میں انہیں ستارہ امتیاز سے نوازا گیا۔

اسماء عباس (قلزم)

اسماء عباس، احمد بشیر کی سب سے چھوٹی بیٹی ہیں۔ انہوں نے پہلے اس کا نام قلزم رکھا۔ ویسے تو احمد بشیر نے اپنی سب بیٹیوں سے جی بھر پیار کیا مگر چھوٹی ہونے کی وجہ سے اسماء سے انہیں خاص محبت تھی۔ وہ ابا کی ماؤں بلی تھی۔ وہ اسے پیار سے مانو کہا کرتے۔ اسماء عباس پاکستانی اداکارہ، پروڈیوسر، گلوکارہ، میزبان ہیں۔ انہوں نے پاکستانی ڈراموں اور دو فلموں میں اداکاری کی۔ ان کی ایک بیٹی زارانور عباس اور دو بیٹے احمد عباس گل اور وقاص عباس گل ہیں۔

ہمایوں شیخ:

احمد بشیر کا واحد بیٹا ہمایوں شیخ ہے جس سے احمد بشیر کو بہت پیار تھا۔ ہمایوں نے ہوٹل مینجمنٹ میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد ایک طویل عرصے سے امریکہ میں مقیم ہے۔ احمد بشیر کے مطابق:

ساری دنیا نے مجھے مانا مگر اپنے باپ اور بیٹے نے مجھے نہ مانا۔(Accept)(۱۶)

وفات:

احمد بشیر کا انتقال ۲۵ دسمبر ۲۰۰۴، کو لاہور میں کینسر کے عارضے کی وجہ سے ہوا۔ وہ ۸۱ سال کی عمر میں اس دنیا فانی سے رخصت ہو گئے۔ ۲۵ دسمبر ۲۰۰۲ء کو رات کا حال ان کی لخت جگر نیلم احمد بشیری کی زبانی درج ذیل ہے۔

"رات دس بجے کے قریب ابا نے اپنی چاروں بیٹیوں کی موجودگی میں کھنچے کھنچے چار سانس لیے۔ ان کی ہر سانس میں لگتا تھا ہمارا دم بھی نکل رہا ہے۔ آخری سانس کے وقت انہوں نے تکلیف سے ناک سکوڑی اور پھر چین کی سکون کی وادی میں اتر گئے، جہاں کوئی تکلیف کوئی اذیت اب انہیں بے حال

نہیں کرے گی اور ایک نیا تجربہ ان کا منتظر ہو گا کہ موت وحیات کے درمیان ایک نئے تجربے، ایک نئی منزل کا ہی تو فرق ہوتا ہے۔(۱۷)

۲۶ دسمبر احمد بشیر کی شادی کی ۵۶ ویں سالگرہ کا دن تھا میت نماز جنازہ کے لیے مین مارکٹ گلبرگ کے سبز ازار میں پہنچادی گئی اور نماز جنازہ کے بعد مارکیٹ کے عقب میں موجود قبرستان میں ایک درخت کے نیچے پہلے سے تیار لحد میں انہیں سپرد خاک کیا گیا۔ جنازے میں اداکاروں، صحافیوں، ادیبوں اور دیگر قریبی عزیز ماسوائے اکلوتے بیٹے (ہمایوں احمد بشیر کے جو دس بارہ روز قبل امریکہ واپس جاچکا تھا) کے سب نے شرکت کی۔

پیشہ وارانہ زندگی اور کریئر:

احمد بشیر کی پیشہ ورانہ زندگی چیلنجز سے بھری تھی۔ ابتداء میں وہ فوج کے پیرا ملٹری شعبے میں دہلی میں افسر ریکرپوشن کے طور پر تعینات ہوئے، جہاں کسان لڑکوں کو فوج میں بھرتی کرنے کا کام کرتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں روالپنڈی میں ممتاز مفتی سے ملاقات ہوئی، جو زندگی بھر کی دوستی میں تبدیل ہوئی دونوں لاہور آئے اور ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ ہوئے، جہاں نامور ادیبوں سے ملنے کا موقع ملا۔ ۱۹۶۷ء میں بمبئی گئے جہاں ساحر لدھیانوی، سعادت حسن منٹو، حمید اختر اور میراجی جیسے ادیبوں سے ملاقات کا موقع ملا اور یوں ان کے اندر چھپی تخلیقی صلاحیتوں کو ایک سازگار فضا میسر آئی۔ اسی دوران ہندو، مسلم فسادات پھوٹ پڑے اور ستمبر ۱۹۶۷ء میں احمد بشیر اور ممتاز مفی لاہور واپس آگئے۔

صحافت (کالم، فیچر، اداریہ)

احمد بشیر پاکستان کے ایک ممتاز صحافی تھے جنہوں نے صحافت کو نئے راستے سے ہمکنار کیا۔ انہوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ۱۹۶۶ء میں ریڈیو پاکستان سے کیا، جہاں وہ اسکرپٹ رائٹر کے طور پر کام کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ روزنامہ "امروز" سے وابستہ ہوئے، جہاں انہوں نے مولانا چراغ حسین حسرت جیسے نامور صحافیوں کے ساتھ کام کیا اور فیچر رائٹنگ کا رجحان متعارف کروایا۔ احمد بشیر کو پاکستان میں تحقیقاتی صحافت کا بانی بھی سمجھا جاتا ہے۔ جس میں انہوں نے سماجی اور تاریخی مسائل پر گہری چھان بین کی۔ ان کی صحافت ترقی پسندانہ تھی اور وہ حکومت، مارشل الاء اور معاشرتی ناانصافیوں پر کھل کر تنقید کرتے تھے۔ بعد میں کراچی منتقل ہوئے اور ریڈیو پر اسکرپٹ رائٹر بنے، پھر موٹر کمپنی میں ملازمت کی۔ سندھ حکومت کے انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں کام کیا اور پبلک سروس کمشین کے ذریعے مستقل انفارمیشن آفیسر بنے۔ "ویلیج ایڈ" محکمے میں حفیظ جالندھری، ممتاز مفتی اور ابن انشاء کے ساتھ کام کیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران لاہور آئے اور ۱۹۶۹ء میں "امروز" میں "شہر سرائے" کالم لکھنا شروع کیا۔

ان کالموں میں موضوعاتی حوالہ سے بڑا تنوع ہے اور معلومات کا ایک جہان آباد ہے۔ اس میں انہوں نے لاہور شہر کی معاشرتی، معاشی، عوامی یا ادبی اور سماجی زندگی کے بیش بہا پہلوؤں پر خاصہ فرساتی کی ہے قلم اٹھایا ہے۔ احمد بشیر کالم نگاری کے آرٹ کی فکری و فنی جہتوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ مثلاً وہ اپنے ایک کالم میں تنقیدی جہت کو بروئے کار لاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جیلانی کامران کی رائے میں پرانے شاعروں میں صرف محمد صفدر میر کی نظم دشت وحشت اور فیض کا کلام باقی بچتا ہے۔ باقی سب دریا برد یعنی باقی جو کچھ ہے وہ اردو ادب کا ایک گزرا ہوا دور ہے جس کا

حال اور مستقبل سے صرف شعری تجربے کی حد تک ربط ہے۔ ورنہ فکری سطح پر سب کے سب گولی

مار دینے کے قابل ہیں۔ تاکہ اگلوں کا راستہ صاف ہو کیونکہ اگلے لنگڑے لولے ہیں جو اس ملبے کو

پھلانگ نہیں سکتے"۔(۱۸)

سرفراز سید لکھتے ہیں:

"احمد بشیر ادب و ثقافت کے حوالے سے ایک اہم معتبر نام! ناول نگاری، کالم نگار، نقاد، فلم ساز، صحافی،

موسیقی کے ماہر اور کیا کیا کچھ تھے"۔(۱۹)

قیام پاکستان کے بعد یہ احمد بشیر کی صحافتی زندگی اور فیچر نگاری کے حوالے سے ابتدائی دور تھا۔ احمد بشیر کی فیچر نگاری کا دوسرا دور ہفت روزہ "لیل ونہار" کے ساتھ وابستہ ہے۔ امین احمد بشیر شائع ہوئے جو سیاسی اور سماجی موضوعات پر ہے۔ اس کے علاوہ احمد بشیر کی فیچر نگاری کا نمایاں اور آخری دور روزنامہ "مساوات" کے اجراء سے شروع ہوا۔ اس میں احمد بشیر براہ راست تین اہم شعبوں سے وابستہ رہے وہ مساوات کا اداریہ بھی لکھتے تھے۔ کالم نگاری اور فیچر نگاری بھی کرتے تھے۔

احمد بشیر علمی و ادبی و صحافتی خدمت کے دائرے میں اداریہ نگاری بھی آتی ہے۔ خاکہ نگاری، مضمون نگاری، فلم سازی، مکتوب نگاری اور ناول نگاری، ریڈیو پر سکرپٹ رائٹر جیسے شعبوں کے ساتھ ساتھ شروع شروع میں شاعری بھی کرتے رہے ہر جگہ ان کی منفرد حیثیت برقرار رہی۔

فلم سازی:

احمد بشیر نے فلم سازی میں بھی بھرپور کام کیا۔ اگرچہ یہ میدان ان کے لیے مالی طور پر کافی مشکل ثابت ہوا۔ ان کی دلچسپئی لم سازی میں بمبئی کے دور سے تھی۔ جہاں ۱۹۴۷ء میں وہ اداکاری کی کوشش میں گئے اور سعادت حسن منٹو، ساحر لدھیانوی اور دیگر ادیبوں سے ملاقات کی۔ لیکن فسادات کی وجہ سے واپس لوٹ آئے۔ امریکن ایڈ پروگرام کے تحت وہ امریکہ گئے اور فلم میکنگ کی تربیت حاصل کی، جو پاکستان سے اس میدان میں تربیت پانے والے پہلے شخص تھے۔ ۱۹۶۹ء میں انہوں نے اردو فلم "نیلا پربت" کی ہدایت کاری اور پروڈکشن کی، جو ایک تجرباتی فلم تھی اور اپنے وقت سے آگے ہونے کی وجہ سے کمرشل طور پر ناکام رہی اس فلم کی ناکامی نے انہیں مالی طرپر برباد کر دیا اور ذہنی تناؤ کا شکار کر دیا۔ جس کا ذکر ان کی خودنوشت میں بھی ملتا ہے۔ احمد بشیر نے اپنی بہن پروین عاطف کے سامائے سے فلم بنائی۔ ممتاز مفتی سے کہانی لکھوائی گئی اور اس میں احمد بشیر نے ضروری ترامیم کی اور مکالمے بھی اس ترمیمی اصول پر خود لکھے۔

اس کے علاوہ وہ انہوں نے قائداعظم کے صد سالہ یوم پیدائش پر ایک دستاویزی فلم بھی بنائی، جو کہ ان کی فلمی خدمات کا ایک ہم حصہ ہے۔ ان کی ادبی خدمات میں "جو ملے تھے راستے میں" (خاکے، مرتب یونس جاوید)، "خون جگر ہونے تک " (مضامین کا مجموعہ)، ڈانسنگ وونور" (انگریزی کالمز کا مجموعہ)، " دل بھٹکے گا" (ناول)، "خطوں میں خوش بو"(مکاتیب، مرتب نیلم احمد بشیر)"خون کی لکیر" "اور دل بھٹکے گا"(ناول) شامل ہیں۔ موخر انداز کرناول ۸۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں انہوں نے تحریک پاکستان کے طویل منظر نامے کی تصویر کشی کی ہے۔

دیگر ادبی خدمات:

مضمون نگاری:

احمد بشیر کی مضمون نگاری ان کی صحافتی اور ادبی صلاحیتوں کا ایک حصہ ہے۔ ان کے مضامین اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوئے۔ ان کے مضامین میں اہم مجموعہ "خون جگر ہونے تک" ہے۔ جب کہ انگریزی میں ان کا مجموعہ "ڈانسنگ ود ود وولوز" (بعض اوقات "ڈانسنگ ولف" کہا جاتا ہے) تاریخی اور سماجی موضوعات پر مبنی ہے۔

ڈانسنگ ود وولوز میں شامل مضمون "کنگڈم آف چاچ براہمن" میں احمد بشیر نے سندھ کی فتح کے بارے میں تاریخی افسانوں کی تردید کی ہے۔ خاص طور پر محمد بن قاسم سے منسوب روایات پر تنقید کی ہے۔ وہ تاریخی حقائق کو تحقیق کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔ یہ مضمون انگریزی میں لکھا گیا۔

"ڈانسنگ ود وولوز" میں شامل مضمون "سٹوری آف دی پنجاب پارٹیشن" میں احمد بشیر نے پنجاب کی تقسیم (۱۹۴۷) کے تاریخی اور سماجی اثرات کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ تقسیم کے دوران ہونے والے فسادات، ہجرت اور اس کے سماجی نتائج پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ڈانسنگ ود وولوز میں شامل مضمون "فیسٹو افار مائی بیہڈنگ" مذہبی انتہا پسندی پر تنقید ہے۔ اس میں مذہبی انتہاپسندی اور فتوؤں کی سیاست پر تنقید کی ہے جو ان کی ترقی پسندانہ سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے اپنی ذاتی زندگی کے تجربات اور سماجی مشاہدات کو شامل کیا ہے۔

مجموعہ "خون جگر ہونے تک" میں متعدد مضامین شامل ہیں۔ جو سماجی ناانصافیوں طبقاتی تفریق، اور سیاسی مسائل پر ہیں۔ ان کی تحریروں نے ترقی پسند تحریک کو تقویت دی اور پاکستانی ادب میں ایک منفرد مقام بنایا۔

مکتوب نگاری:

احمد بشیر کی مکتوب نگاری ان کی ذاتی زندگی، ادبی رجحانات اور سماجی مشاہدات کی جھلک پیش کرتی ہے۔ ان کے خطوط کا مجموعہ "خوشبو" مرتب: نیلم احمد بشیر، ۲۰۰۷ء مکتوب نگاری کا اہم نمونہ ہے۔ یہ خطوط ان کے دوستوں معاصرین اور خاندان کے افراد کے نام لکھے گئے ہیں۔

احمد بشیر نے اپنے بیٹے کو جو خط لکھے ان میں ایک باپ کی شفقت اور ایک دانشور کی باس ملتی ہے۔ اپنے بیٹے ہمایوں جسے وہ پیار سے ہومی کہہ کر مخاطب کرہیں۔ ایک خط مین ان کا انداز ملاحظہ ہو۔

> "پیارے ہومی! یار جی تم نے اب کے بہت دیر کر دی اور نیلم نے بھی بہت راستہ دکھایا۔ ہفتے میں تم دونوں کا ایک ایک خط تو ہمارا حق ہے۔۔ نیلم نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ تم پہلے سے زیادہ ذمہ دار اور سمجھ دار ہوگئے ہو اور بچوں سے تمہاری گہری دوستی ہے اللہ کا شکر ہے۔ مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ میرے چاند کی روح بہت پاکیزہ اور نرم ہے مگر لڑکپن ہے۔۔ سو تم میری امیدوں کے مطابق پھل پھول رہے ہو اور ذہانت کی وجہ سے معاملات کو بھی اچھی طرح سے سمجھنے لگے گے"۔(۲۰)

ناول نگاری:

احمد بشیر کی ناول نگاری ان کی ادبی خدمات کا ایک اہم حصہ ہے ان کے ناولوں میں تاریخی واقعات، سماجی مسائل، اور ذاتی جدوجہد کی علاسی ملتی ہے۔ ان کے اہم ناولوں میں "ل بھٹکے گا" اور "منزل منزل دل بھٹکے گا" شامل ہیں۔

ناول "دل بھٹکے گا" کے صفحہ ۱۱۲ پر والد کی بے روزگاری جو اسلامیہ اسکول ایمن آباد کی نوکری نہ رہنے کی وجہ سے درآئی تھی اور جب سرنگر کی نوکری ملی تو اس وقت کے جذبات واحساسات کو احمد بشیر یوں رقم کرتے ہیں۔

"انسان کی خوشی کے لیے روٹی سب سے بڑی حقیقت ہوتی ہے، جو لوگ کہتے ہیں کہ انسان فقط روٹی ہی کے لیے نہیں جیتا انہوں نے بھوک کبھی چکھ کر نہیں دیکھی۔(۲۱)

"احمد بشیر نے ناول نگاری میں سچ بیانی سے کام لیا اور انہیں افسانوی رنگ میں بیان کرکے ناول میں دلکشی پیدا کی۔ شاہد محمود ندیم: بلھے شاہ کا اوتار احمد بشیر ہی تھا"۔(۲۲)

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو کی رائے:

"احمد بشیر کا شمار پاکستانی ادب کی ہمہ جہت شخصیات میں ہوتا ہے۔بحیثیت ایک ناول نگار، خاکہ نگار کالم نگار، افسانہ نگار، مکتوب نگار، صحافی اور فلم ساز انھوں نے پاکستانی ادب کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ نظریاتی طور پر وہ ترقی پسند ادب سے جڑے ہوئے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی لکھتوں میں ہمیشہ خستہ حال اور پسے ہوئے طبقے کے مسائل اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی تحریر و تصنیف میں

صرف کی۔ ابتدا میں احمد بشیر شاعری بھی کیا کرتے تھے لیکن بعد ازاں انھوں نے اپنے آپ کو نثر کی مختلف اصناف تک محدود کر لیا۔ احمد بشیر ایک ایسے ادیب اور دانشور تھے جنھوں نے امید اور روشن امکانات کے چراغ روشن رکھے"۔(۲۳)

یونس جاوید کی رائے:

"مفتی صاحب کے بقول احمد بشیر کی شخصیت خواب آلودہ ہے۔ درست ! مگر ایسا خواب جس کی تعبیر بشارت بن کر اس کی شخصیت کا احاطہ کئے رہتی ہے اور وہ لحہ لحہ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی کندن، کبھی تانبا کبھی بھٹی سے نکلا ہوا سرخ انگارہ لوہا وہ جو کچھ بھی ہے سامنے ہے کھرا ہے۔اس کی ذات میں نہ تو مختلف مسکے ہیں نہ وہ آستین میں رومال ڈال کر پانی نکالتا ہے لہذا ہم اس کی شخصیت کو شالا مار کے حجرے کی پر اسراریت سے بریکٹ نہیں کر سکتے۔ پر اسرار تو وہ ہے ہی نہیں۔ وہ تو بنوٹ کا کھلاڑی ہے۔ پورے داؤ پیچ کے ساتھ۔ تبھی تو اس کی آواز میں بناوٹ کا ضعف نہیں اعتماد کی کھنک ہے۔ یہ کھنک اسے سچائی اور اس علم نے دے رکھی ہے۔ جس نے اسے اعتبار بخشا ہے۔ وہ کھوٹے کو جانتا ہے اور کھرے کو پہچانتا ہے۔ اس لئے کبھی اس کے ہاتھ میں جسارت کا ڈنڈا ہوتا ہے کبھی جرات کا پتھر۔ بھلے سے سر پھٹے شریانیں ٹوٹیں، جگر خون ہو یا دوسرا لیرولیر"۔(۲۴)

یونس جاوید کی رائے:

"لکھو بے شک جس زبان میں بولو تو اپنی زبان۔۔۔ مگر اسے تینوں زبانوں پر کمانڈ حاصل ہے۔
اس نے تینوں زبانوں میں لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ لکھنا اس کا رزق ہے۔۔ اس کا شوق بھی ہے اور
یہی شوق اس کا جنون ہے"۔(۲۵)

خاکہ نگاری:

احمد بشیر کی خاکہ نگاری اردو ادب کی ایک اہم کاوش ہے ان کی خاکہ نگاری کی ایک کتاب "جو ملے تھے راستے میں" احمد بشیر کے ان خاکوں پر مشتمل ہے جو انہوں نے ۱۹۴۸ اور ۱۹۴۰ کی دہائی میں لکھے تھے اور مختلف جرائد میں چھپے تھے۔ یونس جاوید نے ان خاکوں کو جمع کر کے ایک کتاب کی صورت دے دی۔

احمد بشیر نے جس شخصیت پر بھی قلم اٹھایا پہلے اس کا مکمل مشاہدہ کیا۔ ان کے ساتھ ان کی محبت رہی انہوں نے کسی ایسی شخصیت کا خاکہ نہیں لکھا جس سے ان کی واجبی شناسائی رہی۔ مطلوبہ مواد حاصل کر لینے کے بعد انہوں نے شخصیت پر بے باکی سے قلم اٹھایا۔ کتاب "جو ملے تھے راستے میں "کا آغاز" میں کیوں لکھتا ہوں "احمد بشیر کی تحریر سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد پیش لفظ "پر رہا ہے شہر میں ملا کھلا" احمد بشیر کا مضمون ہے۔ اور پھر یونس جاوید کا وہ روداد خاکہ جو انہوں نے احمد بشیر پر لکھا جس کا نام "جوگی" ہے۔ احمد بشیر نے کتاب میں یونس جاوید کو ان الفاظ میں تحسین پیش کی ہے۔

"پیارے یونس جاوید صحافت میں میرا اچھا خاصا نام تھا۔ تم نے میری پرانی دھجیاں جمع کر کے کتاب
بنادی۔ اب اگر ادیبوں کے قافلے سے مجھے قبول نہ کیا تو؟"(۲۶)

اس کتاب کا انتساب ممتاز مفتی کے نام ہے۔ یونس جاوید کے "جوگی" کے بعد ممتاز مفتی کا خاکہ "غنڈہ" ہے۔ اور پھر احمد بشر کے تیرہ خاکے جو کہ انہوں نے مختلف شخصیات پر لکھے ان کی ترتیب یہ ہے۔ انٹرویو، (چراغ حسن حسرت)، قلندر (مولانا حسرت موہانی)، اکیلا (میراجی)، جپسی (احسان دانش)، شعبدہ باز (ظہیر کاشمیری)، سورمار (ممتاز مفتی)، سر سمراٹ (خواجہ خورشید انور)، پیرومرشید (قدرت اللہ شہاب)، مجاہد (وارث مہر)، راسے کا کنکر (میجر اسحاق)، چھپن چھری (کشور ناہید)، فرلانسر (عبدالمجید بھٹی)، موچھا (بریگیڈیئر عاطف)

حواشی:

۱۔احمد بشیر شخصیت اور فن، ص ۱۲

۲۔ نیلم احمد بشیر۔ چار چاند، اباپیا، ص ۶۰-۶۱

۳۔ نیلم احمد بشیر: چار چاند۔ اباپیا، ص ۶۲

۴۔روزنامہ جنگ (سنڈے میگزین)۸اپریل۲۰۱۸ء۔

۵۔طاہر اصغر، ایک مہم جو دانشور، ماہنامہ نیازمانہ، لاہور، ص ۵۳

۶۔ خصوصی تحریر مندرجہ سند، "صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی" کینٹ ڈویژن گورنمنٹ آف پاکستان، اسلام آباد: ۲۳مارچ ۱۹۹۵ء، ص ۱۔

۷۔مقالہ: احمد بشیر، حیات و فن، ص ۳

۸۔مقالہ: احمد بشیر حیات و فن، ص ۶

۹۔ ممتاز مفتی، غندہ، مشمولہ: جو ملے تھے راستے میں: ص ۵۱

۱۰۔۔ ایضاً

۱۱۔۔ ایضاً

۱۲۔احمد بشیر: شخصیت اور فن، محمد ظہیر بدر اکادمی ادبیات پاکستان، ص ۲۰

۱۳۔ سوانی مضمون "میں اور احمد بشیر، مشمولہ، دو تحریریں، ص ۱۱

۱۴۔۔احمد بشیر، شخصیت اور فن، ظہیر بدر، ص ۵۱۔

۱۵۔۔احمد بشیر شخصیت اور فن، از ظہیر بدر: ص ۲۷

۱۶۔۔ نیلم احمد بشیر، اباپیا، مضمون مشمولہ ماہنامہ سویرا، لاہور، مئی ۲۰۰۵ء، شمارہ نمبر ۱۳، ص ۲۰۲

۱۷۔۔چار چاند نیلم احمد بشیر، اباپیا، ص ۲۰۴

۱۸۔۔احمد بشیر، شہر سائے، کالم مشو ملہ امروز، روزنامہ، ۲مارچ، ۱۹۷۰

۱۹۔ سرفراز سید، راوی نامہ، کالم مشمولہ، روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۷دسمبر ۲۰۰۴ء۔

۲۰۔۔ مجموعہ خطوں میں خوشبو، مرتب نیلم احمد بشیر، ص ۸۵

۲۱۔۔احمد بشیر دل بھٹکے گا، لاہور: فیروز سنز، ۲۰۰۲، ص ۱۱۲

۲۲۔ شخصیت اور فن، ص، ۴۰

۲۳۔ احمد بشیر: شخصیت اور فن: محمد ظہیر بدر (اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۷) کے مقدمے سے ص:٦

۲۴۔ جو ملے تھے راستے میں: یونس جاوید، ۲۰۱۷، احمد بشیر کا خاکہ "جوگی" ص ١٦

۲۵۔ ایضاً: ص ۲۴

۲٦۔ جو ملے تھے راستہ میں، یونس جاوید، ص ۹۲

باب سوم

انٹرویو: چراغ حسن حسرت

خاکوں کا تجزیہ:

احمد بشیر کے خاکہ "انٹرویو" جو کہ مولانا چراغ حسن حسرت کی شخصیت پر لکھا گیا ہے۔ اس میں مولانا چراغ حسن حسرت کے اس پہلو کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ جب احمد بشیر مولانا کے پاس ملازمت کے لیے گئے تھے۔ احمد بشیر نے مولانا کے خدوخال کی جو تصویر کشی کی ہے اس سے مولانا کی تصویر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ احمد بشیر خاکے میں حلیہ، چہرے پر کچھ اس طرح رقم طراز ہیں کہ:

> "دہرے تن و توش کے آدمی تھے۔ موٹی موٹی لال آنکھیں، کچھ اسی گھنی مونچھیں کشادہ پیشانی سر کے بال دونوں کانوں کے اوپر سیدھے کھڑے ہوئے۔ وہ ایک دیو ہیکل آدمی تھے"۔(۱)

اندازِ تحریر:

خاکہ لکھنے سے پہلے احمد بشیر کو اپنی لکھنے کی قابلیت پر بھروسہ نہ تھے کہ وہ لکھنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ اس بارے میں احمد بشیر لکھتے ہیں کہ:

"میں نے ایک آدھ مضمون کہیں لکھ لیا تھا مگر اس سے یہ ثابت نہ ہوتا تھا کہ مجھ میں لکھنے کی صلاحیت ہے میں اپنے آپ کو ادیب نہ گردانتا تھا۔ میرے ادبی معیار میری ذاتی رسائی سے بہت زیادہ بلند تھے"۔(۲)

احمد بشیر نے مولانا چراغ حسن حسرت کی شخصیت کو خاکے میں "علم" کے نام سے لکھا ہے۔ جس سے مولانا چراغ حسن حسرت کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک قابل اور علم سے مالا ماں تھے۔ احمد بشیر لکھتے ہیں کہ۔

"علم ان کے چہرے پر پسینے کی طرح اس بس رہا تھا آیئے مولانا، علم نے مجھے دیکھ کر کہا"(۳)

مولانا چراغ حسن حسرت جب کسی کو پکارتے یا مخاطب کرتے تو اسے مولانا کہہ کر مخاطب کرتے چونکہ یہ ان کا تکیہ کلام تھا۔ احمد بشیر نے مولانا چراغ حسن حسرت سے مولاقات کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کیا اور اسی طرح سے انہوں نے خاکے میں واضح کر دیا جس سے مولانا چراغ کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو قاری پر واضح ہو جاتا ہے۔ مولانا چراغ حسن حسرت صحافتی اخبار نویسی کام کو لے کر کافی سنجیدہ تھے وہ سرخیوں کے ساتھ ساتھ خبروں کی تصیح بھی کرتے تھے خبروں کی ترتیب، اداریے کا اسلوب، کالموں کی ؟؟؟ سرخیوں وغیرہ اخبار کی ظاہری خوبصورتی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ احمد بشیر لکھتے ہیں:

"کاتبوں کی بدلی ہوئی قلموں پر ان کی نظر ٹھہر جاتی تھی۔ غلطی وہ فوراً پکڑ لیتے تھے"۔(۴)

احمد بشیر کے اس خاکے سے مولانا چراغ حسن حسرت کا یہ پہلو بھی ظاہر ہوتا کہ مولانا رند تھے۔ یعنی شراب نوشی اور کوٹھے پر جانے کے عادی تھے۔ جس کی تصور کشی احمد بشیر نے خاکے میں ان الفاظ میں کی ہے۔

"مولانا نے والگا ہوٹل پہنچ کر بیرے کو وسکی کا آرڈر دیا"(۵)

"اس ماحول میں بھی مولانا حسن چراغ حسرت کے رکھ رکھاؤ اور آداب میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مولانا کی اخبار نویسی سے لگن اور مہارت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ جب اخبار کا چپڑاسی بیٹھک میں پہلے کاغذ کی کاپی لے کر آیا۔ تو انہوں نے اس کام کو فوقیت دی۔ طوائف کا کوٹھا اچانک اخبار کا دفتر بن گیا۔ مولانا زمان و مکان کی قید سے فارغ ہو کر محض اخبار نویس رہ گئے۔ انہوں نے جیب سے قلم نکال کر غلطیوں کی تصحیح کی۔ تصویروں کے چربوں کے بارے میں ہدایت دیں"۔(۶)

مولانا وقت کے پابند تھے اور وہ دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔ احمد بشیر کو نوکری دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ:

"دفتر ٹھیک دس بجے لگتا ہے۔ میں دیر سے آنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ تنخواہ آپ کی دوسو روپے ہوگی"(۷)

قلندر: حسرت موہانی:

احمد بشیر نے "قلندر" خاکہ مولانا حسرت موہانی پر لکھا ہے۔ جس کا آغاز مولانا چراغ حسن حسرت کی بے چینی سے ہوتا ہے۔ یعنی اس روز مولانا کو فکر لاحق تھی کہ مولانا حسرت موہانی اگلے روز لاہور پہنچے گے تو ان کی مہمان داری / سیکرٹری کیسے مختص کیا جائے۔ ایسی کشمکش میں کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی ذمہ داری احمد بشیر کے ذمے دے دی۔ احمد بشیر لکھتے ہیں:

"میں نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ مولانا حسرت موہانی کے لئے بہترین سیکرٹری آپ ہی ہو سکتے ہیں۔ باوجود اس امر کے کہ آپ نے ان کا کلام نہیں پڑھا۔ بزرگوں کی عزت بھی آپ کے دل میں نہیں۔ اور منہ پھٹ بھی آپ بہت ہیں۔ مگر دفتر

میں اور کوئی ہے نہیں۔اس لئے یہ ڈیوٹی میں نے بادل نخواستہ آپ کو دی۔امید ہے آپ
تمیز داری سے کام لیں گے۔مولانا میں تو ہمیشہ تمیز داری سے کام لیتا ہوں۔میں نے کہا۔"
آپ کے آگے کبھی بولا ؟"(۸)

اس خاکے کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ حسرت موہانی کس طبیعت کے مالک تھے۔ مولانا چراغ حسن مولانا حسرت مولانی کے متعلق احمد بشیر کو ان الفاظ میں بتاتے ہیں۔

"مولانا حسرت بہت بڑے آدمی ہیں۔ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں ان کا حصہ بہت بڑا ہے۔ مگر آپ کو کیا معلوم۔ میری ان سے کلکتے سے واقفیت ہے۔ مجھ پر وہ بہت شفقت فرماتے تھے۔ وہ بہت شکی آدمی ہیں۔ کوئی غلط بات نہیں سنتے"۔(۹)

اس خاکے کے ذریعے حسرت موہانی کی شخصیت کے اہم پہلو اور واقعات ان کی زندگی میں ہونے والے اتار چڑھائو اور واقعات کے ذکر سے ناصرف ان سے واقفیت بلکہ چلتی پھرتی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

مولانا حسرت موہانی کا انٹرویو کرتے ہوئے جس تجسس سے احمد بشیر نے ان سے سوالات کیے اس سے احمد بشیر کی صحافتی اوصاف بھی واضح ہوتے ہیں کہ انہوں نے حسرت موہانی کو اہم واقعات اور پرانی یادیں یاد دلادیں۔اس خاکے کے ذریعے حسرت موہانی کی بچپن کی شرارتیں، ذہانت، اور تعلیم کا بخوبی پتا چلتا ہے۔اس کے ساتھ ان کی مختلف رفقاء سے ملاقات اور ان سے ان کے کس طرح کے تعلقات تھے سب کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اکبر الہ آبادی کی حسرت موہانی سے محبت، شبلی نعمانی سے ان کی دوستی، شبلی، فیض اور عطیہ کا باہم گھنٹوں بیٹھے باتیں کرنا، سجاد حیدر یلدرم اور پروفیسر ظریف، حسرت موہانی کے ہم جماعت، رتن ناتھ سرشار، استاد داغ اور

آغا حشر سے سرسری ملاقات، عزیز دوست سر عبد القادر اور علامہ اقبال سے دوستی سبھی کا ذکر اس انٹرویو نما خاکے میں موجود ہے۔

اس خاکے کی بدولت حسرت موہانی کا ایک اہم پہلو کہ انہوں نے بھی عشق کیا ہے اس بارے میں ان کی جو گفتگو ہوتی ہے ذیل میں درج ہے۔

"احمد بشیر: شاعر کے لیے عشق کرنا کیا ضروری ہے؟

مولانا: عشق کے بغیر شعر نہیں کہا جا سکتا۔ میرا تو یہ دعویٰ ہے۔

گفتگو بڑی دلچسپ ہو رہی تھی۔ میں نے جسارت کی اور ایک ذاتی سوال پوچھ لیا کہ: مولانا آپ نے بھی عشق کیا ہے؟

فرمانے لگے: ہاں کیا ہے ورنہ میں کہیں شعر کہہ سکتا تھا"۔(۱۰)

اس گفتگو سے حسرت موہانی کی زندگی کا ایک اہم پہلو بھی سامنے آتا ہے اور احمد بشیر کی ہمت و دلیری بھی کہ جس طرح سے انہوں نے حسرت موہانی کا انٹرویو احسن طریقے سے انجام دیا۔

اس خاکے کی بدولت ہمیں حسرت موہانی کے شوق کا بھی پتا چلتا ہے کہ انہیں موسیقی بے حد پسند تھی اور وہ بڑھاپے میں بھی شوق سے موسیقی سنا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں پتنگ بازی کا بھی بے حد شوق تھا۔ احمد بشیر لکھتے ہیں

"مولانا آپ کو گانے بجانے سے دلچسپی ہے۔ آپ کو راگ بھی پسند ہیں؟

بہت پسند ہیں۔ میں تو بڑے شوق سے سنتا ہوں اور لطف لیتا ہوں۔ اس بڑھاپے میں بھی گانا سننا میری سب سے بڑی تفریح ہے"۔(۱۱)

اکیلا: میراجی:

خاکہ نگاری کی صفات میں شخصیت کی ایک مکمل تصویر جس میں خوبیاں اور خامیاں غیر جانبدرانہ طور پر پیش کرنا خاکہ نگاری کی خصوصیت میں شامل ہوتا ہے اور یہی فن احمد بشیر کے خاکے "اکیلا" جو کہ میراجی کی شخصیت پر لکھا گیا ہے واضح طور پر نظر آتا ہے۔ احمد بشیر نے میراجی کی شخصیت کے حوالے سے جو واقعات کی منظر کشی کی ہے اور میراجی کا پراسرار خاکہ قاری پر واضح کیا ہے اس سے میراجی کی شخصیت کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

میراجی کا ظاہری عکس یا حلیہ کچھ اس طرح سے بیان کیا گیا ہے کہ:

> "اس ملاقات میں میں نے میراجی کو اچھی طرح دیکھا۔ وہ ہی کھدر کی قمیض اور خاکی کاڈرائے کی پتلون پہنے تھا۔ اس کا کالر میلا تھا۔ پتلون بہت بڑی تھی۔ جسے اس نے اوپر سے دوہرا کر کے ایک ٹائی سے کمر کے گرد باندھ رکھا تھا۔ کالر کا بٹن کھلا تھا جس من سے اس کی جوگیوں والی مالا کے بڑے بڑے موتی جھانک رہے تھے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں دو دو پیلے گولے تھے۔ بائیں ہاتھ کی منجھلی اور چھوٹی انگلی میں لوہے کے دو باریک چھلے تھے۔ بغل میں وہی بوسیدہ اخباروں کا بنڈل تھا۔ وہ ابھی نہا کے آیا تھا لیکن ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اسے نہاتے ہوئے برسوں گزر چکے ہوں"۔(۱۲)

احمد بشیر کے اس خاکے سے میراجی کی شخصیت، ان کا جوگیوں جیسا حال، ان کا تحکمانہ انداز جیسے سب کو یہ حکیم دے رہے ہوں۔

"میر اجی کا اندازِ گفتگو ایسا تھا کہ جیسے وہ حکم دے رہے ہوں۔ اور انہیں سب سے ظاہری ہمدردی تھی لیکن وہ کسی سے تعلق نہ بناتے تھے۔ اپنی ہی ذات میں گم سم شخصیت کے حامل تھے۔ بات کے رکھ رکھاؤ میں بہت محتاط تھے بحث و تکرار میں خاصی دلچسپی تھی۔ رات کو سونے سے قبل "کرایم اینڈ مسٹری" کے کچھ صفحے لازمی پڑھا کرتے تھے۔ مختلف واقعات کی پیشن گوئیاں کرنا اور پھر اتفاقاً ان کا سچ ہو جانے پر سب پر اپنا رعب اور دھنس جمائی کرتے تھے۔ کسی بات پر حیرت یا ندامت کا شکار نہیں ہوتے تھے بلکہ لاپرواہ سے کام لیتے تھے۔ وہ نہ ہندو تھے نہ مسلمان نہ سکھ۔ ان کا کسی مذہب سے واسطہ نہ تھا بلکہ وہ تو میر اجی تھے"۔(۱۳)

خود کی کہی ہوئی بات کو مستند سمجھتے اور خود کو سب سے اونچا، الگ گردانتے تھے اور کسی کو خاطر خواہ میں نہ لاتے تھے۔ انہیں اپنی ذات دوسروں پر پر اسرار ظاہر کرنے میں خوشی ہوتی تھی۔ احمد بشیر لکھتے ہیں۔

"اس کی ہر بات ایک فتویٰ ہوتی تھی۔ جسے عقل منطق اور انصاف سے کوئی تعلق نہ ہو وہ دھونس اور جبر سے بات کرتا تھا۔ اس کی بات کو جھٹلانا کفر تھا"۔(۱۴)

میر اجی کا انداز گفتگو کا ذکر احمد بشیر کچھ یوں کرتے ہیں۔

"جہاں تک ہم جانتے ہیں۔۔۔

"جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے۔۔۔۔"

میر اجی کو جن عورتوں سے رغبت ہوئی تھی ان میں ایک کا نام میر اسین، دوسری کا نام احمد بشیر نے خاکے میں واضح نہیں کیا لیکن وہ کوئی ادیب خاتون تھیں اور تیسری بادل نام کی شاعر خاتون تھیں۔ میر اجی کا اصل نام تو ثناء اللہ ڈار تھا لیکن ان کی پہلی محبت نے انہیں میر اجی بنا دیا۔ سب سے پہلی عورت جس کی طرف میر اجی نے رغبت ظاہر کی وہی میر اسین تھی جس نے اسے میر اجی بنایا"۔(۱۵)

"میراجی کو کبھی دولت مند بننے کی آرزو نہیں ہوئی۔ لیکن ان کے دوست نے انہیں ایک پٹھان سے ادھار لے کر دیا تھا اس کا قرض اتارنے کی فکر تھی لیکن جب کچھ پیسے ہاتھ آتے تو اسے شراب پی لیتے اور اگلے روز پھر وہی آہ بھر کر کہتے۔

"ہمیں صرف ایک غم باقی ہے"۔(۱۶)

"کرشن چندر کے کودرلاج سے پونا جانے کا اعلان بالکونی میں کھڑے ہو کر اس نے اپنی پاٹ دار آواز میں بغیر کسی کو مخاطب کرتے ہوئے کرتے ہیں۔ہم آج پونا جارہے ہیں"۔(۱۷)

"اور جب وہ جانے لگا تو لوگ اکھٹے ہو گئے وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بچوں کو اپنے گیند بلے بھول گئے، عورتوں کو گھونگٹ نکالنا یاد نہ رہا مرد پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگے۔۔ عرصہ دراز تک وہ کودرلاج میں رہا تھا لیکن کسی نے ایسے سمجھا ہی نہ تھا۔ اسے جانا ہی تھا"۔ (۱۸)

احمد بشیر کے اس خاکے کا آغاز اور اختتام دونوں مندرجہ بالا اقتباس سے کیا ہے۔

"جب میراجی کودرلاج سے پونا جارہے تھے۔ تو سب لوگ حیران تھے۔ وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز تھا۔ ان کے چہرے پر دل سے مسکراہٹ تھی۔ جیسے لذت لے رہے ہوں۔ لوگ چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے۔۔ مگر جب وہ جانے لگا تو اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا"۔(۱۹)

چیپی: احسان دانش:

احمد بشیر نے خاکہ "چیپی" "احسان دانش" کی ذات پر لکھا ہے۔ اس خاکے میں احمد بشیر نے احسان دانش کے حلیے، اندازِ زندگی، طبیعت اور پیشہ ورانہ زندگی کا تمام احوال بڑی برجستگی سے بیان کر دیا۔ قلبی راحت کے لیے وہ اپنے دوستوں یاروں، راہ گیروں اور جو کوئی ان کے پاس مدد کے لیے آجائے مشورے دیتے، عملی طور پر مدد کی یقین دہانی کرواتے اور وعدے کر لیتے لیکن ہر رات ہی سوچ کے سوتے کے اگلے روز سے کسی کا کام نہیں کرے گا لیکن دوبارہ سے وہی چال چلن رہتا ہے ان کے پاس کوئی دکان کے لیے، بیوی سے صلح کے لیے اور نوکری وغیرہ طرح طرح کے مسائل کے لے کر لوگ آتے تھے لیکن اگر کوئی اسے کام نہ کہے تو احسان دانش کو بے چینی رہتی تھی۔ احسان دانش کے گھر تخت پوشد کے پاس رکھے میز پر رکھے نوٹ کو جس کا ذکر احمد بشیر نے خاکے میں کیا ہے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ احسان دانش کے پاس فضول گئی کے لیے کوئی وقت نہیں لیکن اس کے باوجود جب کوئی آتا تو اس سے خوب باتیں کریں گے۔

احمد بشیر نے خاکے میں احسان دانش کے مختلف پیشوں کو بڑی روانی سے پیش کر دیا ہے۔ احسان دانش کی زندگی بڑی طلاطم کا شکار تھی۔ انہوں نے قصائی سے لے کر پرسنل اسسٹینٹ، کاندھلے کی میونسپلٹی میں چپڑاسی، چوکیداری، چٹھی رسانی، مالی گری، مزدوری، معماری، زین سازی، رنگ سازی، اخبار کی ایڈیٹری، پریس میں پروف، کوئلہ بیچنا غرض ہر طرح کا کام احسان نے اپنی زندگی میں کیا۔

احسان دانش پانچ وقت کا نمازی تھا۔ مطالعے کا شوقین تھا۔ بزنس انہیں پسند تھا لیکن اس کے لیے سرمایہ نہیں تھا۔ سرمایہ داری سے اسے نفرت تھی۔ شاعری اسے پسند نہ تھی لیکن وہ شاعر تھا۔ مذہب کو صراط مستقیم مانتا تھا۔ احمد بشیر لکھتے ہیں۔

"وہ ایک خوددار آدمی تھا اگرچہ ایک عمر کی محتاجی اور مفلسی نے اسے تھوڑا بہت خوشامد پسند اور شیخی باز بنا دیا ہے"۔(۲۰)

احمد بشیر نے جہاں احسان دانش کے اوصاف بتانے وہی ان کی پیشہ ورانہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات بھی بڑی بے باقی سے بیان کر دیے ہیں۔ ان کی چالاکیاں، تیل چوری کرنا، پیری مریدی اور شمعی سے محبت اور اس میں ناکامی سب کچھ بیان کر دیا ہے۔ خاکے کو پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ احسان دانش غلط کام کرتا ہے لیکن اسے احسان بھی ہے۔ احمد بشیر لکھتے ہیں:

"اس نے اپنی تمام عمر میں بہت دکھ، محتاجی دیکھی ہے شاید اسی لیے اس کے دل میں لوگوں کی سرپرستی اور حاجت مندی کو مدد دینے کی ایک شدید خواہش پیدا ہو چکی ہے یا ممکن ہے یہ خواہش اس کے فطری احساس کمتری کا ردعمل ہو"۔(۲۱)

"احسان نے زندگی میں دو دفعہ شراب پی ایک دفعہ دوست کے اسرار کرنے پر اور دوسری بار دوست کو شراب چھوڑنے کے لیے کہا۔

"آج سے شراب چھوڑ دو۔"

دوست بھونچکارہ گیا اور احسان کی طرف دیکھنے لگا۔

"میری خاطر" احسان نے سنجیدگی سے کہا۔

کچھ دیر تک دوست چپ بیٹھا رہا۔ پھر دفعتاً اٹھ بیٹھا اور ساغر کو زمین پر پٹخ دیا۔۔۔

اس شرط پر احسان آج بھی شراب پینے کو تیار ہے"۔(۲۲)

احسان دانش کی زندگی کے ان پہلوؤں کو خاکے میں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ احمد بشیر اور احسان دانش کی اکثر ملاقات ہوتی رہی۔ اور احمد بشیر نے ان واقعات کو بڑی روانی اور برجستگی سے اس خاکے میں بیان کر دیا ہے۔

فلم بندی والا انداز

شعبدہ باز: ظہیر کاشمیری:

شعبدہ خاکہ ظہیر کاشمیری کی شخصیت پر احمد بشیر نے لکھا ہے۔ اس خاکے میں احمد بشیر نے ظہیر کاشمیری کی پوری شخصیت کا اظہار چند پہلو بیان کر کے قاری کے سامنے کر دیا ہے۔ ظہیر کاشمیری حلیہ نگاری احمد بشیر نے کچھ ان الفاظ میں کی ہے۔

"چہرہ چھلا ہوا ناک مڑی ہوئی دانت چوہے کی طرح کیلئے آنکھیں بھوری اور اندر کو بیٹھی ہوئیں ، ہونٹ پہلے اور کمان کی طرح اندر کو جھکے ہوئے رخساروں پر چیچک کے گھلے گھلے داغ جو دور سے دکھائی نہیں دیتے۔ لہریا بالوں اور مخروطی داڑھی کا رنگ میلے اور پرانے خون سے مشابہ۔ اس کی وضع قطع اور شکل و صورت کو خوبصورتی یا بد صورتی سے کوئی تعلق نہیں"۔(۲۳)

ظہیر کاشمیری کی والدہ پرہیز گار خاتون اور نماز و روزے کی پابند تھیں اور یہی انہوں نے ظہیر کی طبیعت میں بھی شامل کر دیں تھیں۔ لیکن ظہیر کا باپ جب شام کو گھر تھکا ہارا آتا تو اپنی تھکان کے لیے ظہیر کو ضرور مارتا۔ یہ

معمول تھا بس اسی میں ظہیر دین سے دور اور ڈھیٹ ہوتا چلا گیا۔ اور یہی سے اس کی شخصیت نئے نئے رنگوں میں ڈھلتی چلی گئی وہ مغرور ہو گیا اور کسی کو خاطر خواہ میں نہ لاتا ار نہ ہی کسی کو خود کے برابر سمجھتا۔ وہ لوگوں میں خود کو منفرد منواتا اور اس کے لیے الگ الگ ہتھکنڈے آزماتا تاکہ لوگ اس کی ان حرکتوں سے اس پر حیران ہوں اور اسے منفرد سمجھیں۔ پڑھائی میں دل نہ لگا لیکن جب پہلا شعر کہا اور اپنے ساتھیوں پر رعب جتلایا تو اس نے مزید کوشش کیں اور اپنا مطالعہ بڑھایا اور اس طرح سے ظہیر ایک شاعر، ادیب اور سیاسی رہنما بن گیا۔ اپنی شعبدہ بازیوں پر لوگوں سے بات بات پہ "ہائیں" نکلواتا اور انگلی گھما گھما کے بات کرنا ظہیر کا پسندیدہ شیوہ ہے۔

انقلاب کے حامی اور کسانوں اور مزدورں کے لیے آواز اٹھانے والے ظہیر نے قید بھی کاٹی اور قید کے دوران قیدیوں کو بغاوت پر اکساتا رہا لیکن گوپال داس سہگل سے ملاقات جس میں اسے فلم راگنی میں گانے کا کام ملا تو وہ انقلاب اور کسانوں کی آواز بھول کر شراب نوشی میں مصروف ہو گئے۔

> "گو پال داس سہگل نے ظہیر کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔ رخ موڑنے کا یہ مطلب نہیں کہ ظہیر اپنا آدرش بھول گیا۔ اس کا دائرہ عمل بدل گیا۔ لیکن اس کی ذات اور آئیڈیل نہ بدلے۔ گوپال داس سہگل مہیشوری پکچرز میں کرتا دھرتا کی حیثیت رکھتا تھا اس نے ظہیر کو راگنی فلم کے گانے لکھنے کام دلوایا۔ اسے امر تسر چھوڑنا پڑا"۔(۲۴)

دماغ سے کام لینے والے ظہیر کو جب محبت ہوئی تو دل دماغ کو چھوڑ کر دل سے کام لیا لیکن محبت اسے راس نہ آئی اور دونوں دفعہ ناکام رہا۔ خود کو الگ اور منفرد کرتے کرتے وہ خدا کی تو ہیں؟؟؟

احمد بشیر نے ظہیر کی پوری شخصیت کو پوری طرح سے خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اس خاکے میں پیش کر دیا ہے۔ جس نے ظہیر کو نہ بھی دیکھا ہو وہ اس تصویر کشی سے اس کی پوری شخصیت ظاہری و باطنی جہاں تک احمد بشیر جانتے تھے سب بیان کر دیا ہے۔

سورما: ممتاز مفتی:

ممتاز مفتی پر لکھے گئے خاکہ کو احمد بشیر نے "سورما" کے نام سے پیش کیا ہے۔ اس خاکے میں احمد بشیر نے ممتاز مفتی کی شخصیت کو خوبیوں اور خامیوں سمیت بڑی بے باکی اور برجستگی سے بیان کر دیا ہے۔ ممتاز مفتی اور احمد بشیر کا ساتھ اکاون برس رہا دونوں دوست تھے، دونوں ایک دوسرے کی شخصیت سے اچھی طرح سے واقف تھے۔ اسی لیے احمد بشیر نے ممتاز مفتی کی شخصیت کے وہ پہلو بھی جس سے عموماً ان سے جڑے لوگ بھی آشنا نہ تھے بڑی صاف گوئی سے بیان کر دیا ہے۔

ممتاز مفتی کی شخصیت طلاطم کا شکار رہی ان کی شخصیت کے متعلق ہر کسی کی رائے مختلف رہی۔ احمد بشیر ممتاز مفتی کے حلیے کو مندرجہ ذیل الفاظ میں لکھتے ہیں۔

> "ممتاز مفتی بچپن اور سنجیدگی کا امتزاج ہے چھوٹے قد کا سخی آدمی لمبوتر و چہرہ گدلی گدلی بے جان آنکھیں اور بڑا سا سر بات کیجئے تو آپ حیران رہ جائیں گئے ارے یہ تو محض جی حضور ہے۔احساس برتری کی ایک لہر آپ کے رگ وپے میں دوڑ جائے گی۔ چھاتی قدرے باہر کو اینٹھ آئے گی"۔(۲۵)

ممتاز مفتی نے اپنے بارے اپنی ڈائری میں لکھا اس کا کچھ حصہ ملاحظہ کریں۔

"سند باز جہازی کی طرح میرے کندھوں پر بچپن کا بڑھا سوار ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ لوگ اس بھید سے واقف ہو چکے ہیں اور مجھ پر ہنتے ہیں۔ مدت تک میں کوشاں رہا کہ لوگ مجھے ایک سنجیدہ آدمی سمجھیں اور مناسب اہمیت دیں۔ اس مسلسل کوشش کا صرف یہی نتیجہ ہوا کہ میرے ماتھے پر ایک تیوری ابھر آئی۔ اور اب میں اسے مٹانے کی ناکام کوشش میں لگا رہتا ہوں۔ میری طبیعت بے ہنگم بے لگام اور بے صبر ہے۔ اس میں روانی نہیں، نظم نہیں ضبط نہیں۔ میری طبیعت میں بنیادی طور پر جو جذبہ کارفرما ہے وہ جھجک اور کمتری ہے۔ مجھ میں با قاعدہ چلنے کی اہلیت نہیں۔ ہاں کبھی کبھی برک کر بے تحاشا دوڑ پڑتا ہوں۔ میری شخصیت پر عورت کا عصر وضاحت کے ساتھ غالب ہے۔ اگر میرا ذہن ایک پکی سڑک ہے تو دل میں ایک ابھی ہوئی پگڈنڈی۔ دونوں میں کوئی مناسبت نہیں۔ جس کی وجہ سے میری طبیعت میں توازن نہیں ربط نہیں۔ سکون نہیں۔ ہر گھڑی ایک کشمکش رہتی ہے"۔(۲۶)

ممتاز مفتی کو لوگوں کے ہجوم میں گبھراہٹ ہوتی ہے وہ کسی سے ملنے سے ہچکچاتے ہیں۔ فضول خرچی کا شوق تھا۔ جھوٹ بولنا، راز پوشیدہ نہ رکھ پانا۔ ان کی شخصیت میں شامل تھا۔ اپنی مرضی کے مالک تھے۔ راگ کے شوقین تھے راگ سے تسکین ملتی تھی۔ انہیں زندگی میں دوبار محبت ہوئی اور اس بارے میں اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ:۔

"میری محبت کی گاڑی شک اور کمتری کے پہیوں پر چلتی ہے۔ محبوبہ کے نقاب کا ہر تار مجھے ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مجھے کنواری لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کسی مٹیار کی

ایک بے نیاز نگاہ پر دوشیزگی نو خیزی معصومیت اور الہڑ پن تج دینے کو تیار ہوں مجھے بد معاش عورت سے عشق ہے"۔(۲۷)

احمد بشیر نے ممتاز مفتی پر خاکہ لکھا جس میں ممتاز مفتی کی شخصیت کو پوری طرح سے اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن کہیں کہیں بے جا طوالت بھی نظر آتی ہے۔ ممتاز مفتی خود کو برتر اور جن لوگوں سے واسطہ نہیں ان کی عزت کرتا ہے۔ لیکن اپنے سے جڑے لوگوں کے لیے سخت الفاظ استعمال کرتا ہے۔ ممتاز کی سختیانا اور تکبر کا عنصر بھی احمد بشیر نے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"اس نے فیصلہ کیا کہ جو کچھ میرے منہ سے ایک مرتبہ نکل جائے گا چاہے وہ کیسا ہی نا معقول اور غلط ہو گا پتھر کی لکیر ہو گا۔ میں مان لوں گا کہ میں نا معقول اور غلط ہوں مگر میں ایسا ہی ہوں۔ اب جیسا بھی ہوں مجھے مانو۔ میرے آگے سر تسلیم خم کرو۔ ورنہ میں تمہیں پہچانتا بھی نہیں۔ اس نے عقلیت پسندی معقولیت اور علت و معلول کے منطقی تعلق سے منہ موڑ لیا اور روحانیت کے چبوترے پر گیان کی سمادھی جما کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں معرفت کا تر شول ہے جس سے وہ ان کو زخم لگاتا رہتا ہے جو اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ مجھ جیسے بے وضو لوگ جو پچاس برس سے اس کے مخیر چلے آتے ہیں اس کی مجلس میں اب رسمی گفتگو ہی کر سکتے ہیں یا اس کی ہر بات پر آمنا و صدقنا ہی کہہ سکتے ہیں یا اس کی باطنی بصیرت پر حیرت کی گول گول آنکھیں ہی کھول سکتے ہیں"۔(۲۸)

ممتاز مفتی کو اپنے رویے پر غور کرنے کے لیے بھی احمد بشیر نے تاکید کی ہے لکھتے ہیں۔

"اپنے عزیز ترین دوستوں کی توہین کرنے ان کے خیالات کو بہ زور بدلنے ان کی کافرانہ شخصیت کو فی سبیل اللہ فنا کر دینے کی لت اس میں پندرہ برس پہلے پیدا ہوئی اور اب یہ

اس کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔اس لئے ان کو جو اس کے پیارے ہیں یا جو اس کو پیار کرتے ہیں اگر اس کے مسلک پر نہیں چلتے انہیں اس کی حضوری میں ڈرنا چاہیے۔غیروں کو وہ کچھ نہیں کہتا۔ان کی وہ بڑی عزت کرتا ہے۔ان کا مان بڑھاتا ہے۔اپنوں کو جان بچانی چاہیے۔دو برس پہلے میں نے دم رخصت اس سے کہا تم اپنے رویوں پر غور کرو۔ تمہارا مرشد قدرت اللہ شہاب ایک جمالی آدمی تھا۔تم جلال کی پھنکاریں نہ مارا کرو۔انا الحق کے دعوے مت کیا کرو۔لوگوں کو جو تمہارے قرب کے باوجود اپنی زندگی گزارنا چاہتے ہیں ٹکڑے ٹکڑے مت کیا کرو"۔(۲۹)

احمد بشیر نے اس خاکے میں ممتاز مفتی کا اپنوں سے رویہ، ان کی انا اور تکبر،خود پرستی کے ساتھ روحانیت کے مرتبے پر خود کو فائز سمجھنے کو بڑی بے باکی اور سفاکی سے پیش کیا ہے۔ساتھ میں وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ میری شخصیت میں یہ بہادری، دلیری، ادیبانہ صلاحیت کو ممتاز مفتی نے روشناس کرایا۔

اور آخر میں ممتاز مفتی کی آخری منازل کے لیے دعا گو ہیں۔احمد بشیر نے دوستی کے ناطے ممتاز مفتی کو خطوط میں ان کی اپنی شخصیت پر نظر ثانی کرنے کی بھی تاکید کی لیکن ساتھ ہی ان کی شخصیت کے پہلوؤں کو سچائی، سفاکی، بے باکی سے قاری کے سامنے پیش بھی کیا ہے۔

آخر میں ان کے انتقال کے بعد ان کے خاکے کو مکمل کرتے ہوئے احمد بشیر ایک جملے میں ان سے اپنے تعلق کو یوں ظاہر کرتے ہیں:

"الوداع ممتاز مفتی! میں نے تمہارے ساتھ اکاون بھرپور سال گزارے، اس طویل عرصے میں تم نے ایک دن بھی مجھے فراموش نہیں کیا"۔(۳۰)

راستے کا کنکر: میجر اسحاق:

فوج کا بہادر سپاہی، کسانوں اور مزدوروں کا ہمدرد اور اپنا سچا پاکستانی، انقلابی مضبوط قوت ارادی کا مالک مخالف قوتوں کے خلاف ڈٹے رہنے والے میجر اسحاق خود کو مخالفین کے راستے کا کنکر کہتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایک سچے ادیب نے اس خاکے کا نام راستے کا کنکر رکھا۔ اس خاکے میں میجر اسحاق کی زندگی کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈال کر میجر اسحاق کی شخصیت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ نا جانے ملکِ پاکستان کے لیے ایسے کتنے ہی بہادر و نڈر سپاہی اپنے ملک کے لیے ایسی قربانیاں دیتے ہیں لیکن وہ پسِ پردہ ہی رہتے ہیں۔ لیکن احمد بشیر نے ایک ایسے ہی سچے پاکستانی سپاہی کو ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ احمد بشیر خاکے میں لکھتے ہیں۔

> "میجر اسحاق غالباً ایک ہی انقلابی تھا جو خالص پاکستانی پیداوار تھا۔ اس نے بہت کچھ کیا اگر چہ اس نے کوئی ٹھوس کامیابی حاصل نہیں کی۔ مگر وہ آنے والے قافلوں کے لئے ایک راستہ متعین کر گیا ہے تا کہ وہ تخلیقی اور با شمر زندگی گزار سکیں۔ وہ کہتا تھا کہ میں تو راستے کا ایک کنکر ہوں۔ مگر اس کنکر نے بھی تاریخ کے کاروان کے گزرنے کا راستہ ہموار کر دیا۔ اللہ اس کی روح کو سکون دے"۔(۳۱)

تحریک آزادی کشمیر پر سابقہ حکومتوں کی حکمت عملیاں اور اس میں پیش آنے والے مختلف واقعات کے ساتھ راولپنڈی سازش کیس اور میجر کا چھ مرتبہ جیل جانا اور پھر ان کی صحت کے بگڑ جانے پر بھی بہادری سے ان سب کا سامنا کرنا سب کا ذکر اس خاکے میں ملتا ہے۔ جس سے میجر اسحاق کی شخصیت ابھر کر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔

احمد بشیر لکھتے ہیں:

"میجر اسحاق محمد ایسے ہی ضدی آدمی تھے موت انہیں چارپائی سے اٹھا کر لے گئی"(۳۲)

پیر و مرشد: قدرت اللہ شہاب:

احمد بشیر نے قدرت اللہ شہاب کو "پیر و مرشد" کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ جو ان کی روحانی حیثیت کو اجاگر کرتا ہے۔ خاکے میں قدرت اللہ شہاب کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ جیسے ان کی بیوروکریٹک زندگی، ادبی خدمات اور دوستوں کی مدد(۱) قدرت اللہ شہاب کی خودنوشت "شہاب نامہ" کا بھی خاکے میں ذکر ہے۔ جہاں احمد بشیر کہتے ہیں کہ ابتدائی میں کتاب کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن یہ ان پر اس قدر حاوی ہوگئی کہ انہوں نے اسے غلط طور پر رد کیا۔ احمد بشیر کے الفاظ میں:

"میں نے غلط کہا کہ کتاب مجھے پسند نہیں آئی۔ یہ میں نے چل کر کہا تھا کیونکہ یہ ایک کتاب مجھ پر حاوی ہوگئی تھی حالانکہ میں نے اس سے پہلے بہت سی اچھی کتابیں پڑھی ہیں"۔(۳۳)

یہ خاکہ طویل اور تفصیلی ہے، جو قدرت اللہ شہاب کی زندگی کے واقعات کو دلچسپ طریقے سے بیان کرتا ہے۔ اس خاکے میں دیگر لوگوں کا ذکر بھی ہے جن میں ممتاز مفتی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور بن انشاء وغیرہ شامل ہیں۔ اس خاکے کا آغاز "شہاب نامہ" سے ہوتا ہوا قدرت اللہ شہاب کے آخری وقت تک کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اس خاکے میں قدرت اللہ شہاب کی خوبیوں کے ساتھ اس کی دنیاداری اور خامیوں کا بھی ذکر ہے۔ اس خاکے کو ادبی دنیا کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ احمد بشیر قدرت اللہ شہاب کی شخصیت کو بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

"شہاب ایک مجموعہ اضداد شخص تھا بیک وقت کمزور اور طاقتور۔ ذرا خیال کرو کہ شہاب جیسا معمولی قد و قامت کا شخص جس پر راہ چلتے کوئی شخص دوسری نظر ڈالنی ضروری نہ سمجھے بچپن میں ایک مہندر بنے کو چڑانے کے خیال سے زور زور سے درود شریف کی تلاوت کرتا ہے کہ اسی مستی میں روزانہ بائیں میل کا پیدل سفر کر لیتا بڑا ہوتا ہے تو ایمن آباد کی چندر اروتی کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ روزانہ بائیسکل پر ستر میل آتا جاتا ہے مگر لڑکی کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ کیا اس سے بڑی بہادری کہیں ممکن ہے"؟۔(۳۴)

"مگر وہ اپنے قریبی دوستوں کی امداد سو قانون توڑ کر بھی کرتا تھا اور اس سلسلے میں جائز و نا جائز کی پرواہ بالکل نہ کرتا تھا اس کے خیال میں نوکری اور روزگار میں جائز اور ناجائز کا سوال پیدا نہیں ہوتا"۔(۳۵)

مجاہد:وارث میر:

وارث میر پر لکھا گیا خاکہ "مجاہد" احمد بشیر نے ان کی وفات کے بعد لکھا۔ اس خاکے میں وارث میر کے آخری ایام کے ساتھ ان کی مجاہدانہ زندگی کے کچھ پہلوؤں کا بھی ذکر ہے۔ وہ ادیب تھے اور پروفیسر بھی۔ اور تعلیم دینا(یعنی استاد)ان کا پیشہ تھا۔ سچائی اور دیانتداری سے زندگی گزاری۔ صحافت میں بھی ایک نمایاں نام رہا۔ ریاستی جبر اور استحصالی کے باوجود انہوں نے سچائی کا راستہ نہ چھوڑا۔ انہوں نے اپنے قلم سے جہاد کیا۔ احمد بشیر لکھتے ہیں۔

"وہ ایک معصوم خاندان کا سر براہ تھا۔اس نے اپنے چار بچوں کو دیانتداری اور سچائی سے زندگی بسر کرنا سکھایا تھا۔اس کی بیوی اور ایک ہی بچی صبر و استقلال کی دولت سے

مالا مال تھیں۔خود وہ اگلے وقتوں کا مجاہد تھا۔وہ عالمی اور ابدی حقیقتوں کے لئے لڑتا تھا۔وہ پاکستان پر جان چھڑکتا تھا۔اسلام کے انقلابی پہلو کا ترجمان تھا۔مساوات پر یقین رکھتا تھا۔ مارشل لاء کی وجہ سے یہ ساری اقدار خطرے میں پڑ گئی تھیں اس لئے وہ سدا بے چین اور سدا مصروف جہاد رہتا تھا۔وہ ایسا پاکستانی تھا جیسا قائد اعظم اپنے تصور میں دیکھتے تھے۔ وہ اقبال کا ممولا تھا جس سے شہباز ڈرے"۔(۳۶)

لیکن وارث میر کو اس قلم کی بڑی قیمت چکانی پڑی۔ان کے بیٹے کو ایک جھوٹے قتل کے مقدمے میں ملوث کر دیا گیا اور اس کے بدلے میں وارث میر کو پارٹی نے پیش کش کی یہ ان کے خلاف نہیں لکھا کریں گے تو وہ ان کے بیٹے کو چھڑوا دیں گے۔ لیکن وارث میر نے یہ گوارا نہ کیا اگر وہ ایسا کرتے تو اپنے ضمیر کی آواز کو دبا دیتے۔اس پر انہوں نے اپنے بیٹے کی آزادی کو قربان کر دیا۔لیکن وہ اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے کوشش کرتے رہے۔وارث میر کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا رہا ہو گیا۔احمد بشیر ان کی شخصیت کے متعلق لکھتے ہیں۔

"وارث میر ایک انتہائی ایماندار اور مخلص دانشور تھا۔موت سے پانچ سال قبل تک وہ ایک قدامت پسند مسلمان تھا جو رسمی مذہب پر یقین رکھتا ہے۔وہ جدیدیت کے خلاف تھا ظواہر پر ایمان رکھتا تھا۔نئے رجحانات پر شک کرتا تھا۔ترقی پسندی کو اسلام دشمنی سمجھتا تھا۔کمیونسٹوں کی جان کا دشمن تھا۔امریکہ کے افغان جہاد کا حامی تھا۔روسیوں کے خون کا پیاسا تھا اور جماعت اسلامی کا ہم زبان تھا۔وہ ان موضوعات پر مباحثے کرتا اور لڑائیاں کرتا تھا۔وہ ریاستی دانشور تھا"۔(۳۷)

وارث میر اپنے آخری وقت میں بہت دکھی اور مایوس ہو چکے تھے۔ وسیع تعلقات ہونے کے باوجود اپنے بیٹے کو نہیں چھڑوا سکے۔ آخری دنوں میں بھی انہوں نے اپنا قلم نہیں چھوڑا اور آواز اٹھاتے رہے۔ لیکن وہ اب زندہ نہیں رہنا چاہتے تے۔ احمد بشیر لکھتے ہیں۔

"اب جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ وارث میر زندہ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لئے وہ رات بھر حکیم کی پڑیاں کھا کے کرسی پر بیٹھا ضیاء الحق کے خلاف مضمون لکھواتا رہا۔ صبح سویرے جب اس کے بچے مجبور کر کے ہسپتال لے گئے تو ڈاکٹر ابھی پڑے سوئے تھے۔ آدھا گھنٹہ کسی ڈاکٹر کی تلاش میں گزر گیا۔ بالاخر جب ایک ڈاکٹر ہاتھ آیا تو وارث میر نے غصے سے کہا کہ اگر میرا اوقت آچکا ہے تو کیا تم مجھے بچا سکتے ہو؟اس کا غصہ ڈاکٹر کے خلاف نہیں تھا وہ اپنے بچوں سے مخاطب تھا جو اسے ہسپتال میں اس امید پر لائے تھے کہ وہ زندہ رہے گا۔ پھر وہ اٹھ کر خود بستر پر چڑھا بستر پر چڑھ کر اس نے خود کلمہ شہادت پڑھا-----۔ اشہد ان لا الہ-----۔ دو گھنٹے بعد وہ اپنے سچے مولا کے حضور پہنچ چکا تھا۔ اس کی موت کی خبر اس طرح پھیلی جیسے شہر میں آگ لگ گئی ہو"۔(۳۸)

ایک انقلابی مجاہد اور سی پاکستانی مایوسی کے عالم میں اس دنیافانی سے رخصت ہو گیا۔

سر سمراٹ: خواجہ خورشید انور:

سر سمراٹ خاکہ، جو کہ احمد بشیر نے خواجہ رشید انور کی ذات پر لکھا ہے کا آغاز خواجہ خورشید انور کی طرف سے احمد بشیر کی قلم "نیلا پربت" پر ملنے والی داد سے ہوتا ہے جس کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

"خواجہ خورشید انور نے جو داد اس فقیر کو اس کی فلم " نیلا پر بت دیکھنے کی بعد دی اور کسی کو نہ دی۔ انہوں نے کہا۔ فلم تو خیر تم نے جو بنائی سو بنائی مگر اتنا ہے کہ تم ڈائرکشن کا فن سیکھ سکتے ہو "۔(۳۹)

اس خاکے کی نسبت یہ معلوم ہوتا ہے کہ احمد بشیر خواجہ رشید انور سے خاصے متاثر تھے۔ انہوں نے اس خاکے میں خواجہ رشید انور کا موسیقی سے لگاؤ۔ کلاسیکی دھنیں، ڈائریکشن کا فن کو بڑی باریکی سے خاکے میں بیان کر دیا ہے۔ اس خاکے میں شخصیت نگاری کے ساتھ فلم سازی اور موسیقی کے رموز کا بھی خاکہ کھینچا گیا ہے۔ خواجہ خورشید انور کو چربہ فلمیں اور چربہ دھنیں پسند نہ تھی وہ کلاسیکی دھنوں کو اہمیت دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے آخری وقت تک بھی کام نہ ہونے کے باوجود بھی چربہ دھنوں کے لیے کام نہیں کیا۔ اپنے کام سے انہیں لگاؤ تھا وہ جو کام کرتے اس میں کسی دوسرے کو بولنے کا موقع نہ دیتے اپنی مرضی سے کام کرتے اس بارے میں احمد بشیر لکھتے ہیں:

"اپنی موسیقی کی ریکارڈنگ میں بہت سخت گیر تھے۔ ایک ایک دھن وہ کئی بار ریکارڈ کرواتے تھے۔ وہ چھوٹی سی غلطی بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ ریکار ڈسٹ بھی ان کو ایک ہی پسند تھا۔ پروڈیوسر کو اپنی دھنوں کے پسند نا پسند کا اختیار نہ دیتے تھے۔ ان کی عظمت کی ایسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ پروڈیوسر ان کی کسی دھن پر ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کی جرات نہ کرتا تھا"۔(۴۰)

خواجہ خورشید انور کی شخصیت نگاری سے زیادہ اس خاکے میں ان کام کی وضاحت اور ان کے چند پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہئے۔ توکل حسین خاں کی شاگردی اور ان کے انقلابی ہونے کا ذکر ہے۔ یہ خاکہ ایک طرح سے تعارفی خاکے کا پیش خیمہ بھی ہے۔ خواجہ خورشید انور کے متعلق احمد بشیر لکھتے ہیں:

"وہ ہر کہہ ومہ سے بات کر لیتے تھے مگر ان تک پہنچنا بہت مشکل تھا۔ وہ بادشاہ تھے یا
دیوتا۔ کوئی ان کے اندر کی اندر سبھا تک رسائی حاصل نہ کر سکتا تھا۔ وہ ایک ایسا تانپورہ
تھے جو ہمیشہ چھڑا رہتا ہے اور جس میں سے راگ طلوع ہوتے رہتے ہیں"۔(۴۱)

عربی، ایرانی اور مغربی نظاموں کے مطالعے کے باعث خواجہ خورشید انور عربی، ایرانی اور مغربی موسیقی سے بھی اچھی طرح سے واقف تھے۔ پہاڑ اور درخت انہیں بہت پسند تھے وہ زیادہ رومانوی فلمیں بناتے تھے تو پہاڑ، درخت اور بادل وغیرہ کا بیک گراؤنڈ لازمی ہوتا تھا۔ موسیقی سے اس قدر لگاؤ تھا کہ آئی سی ایس کے امتحان میں کامیابی کے بعد جس دن ان کا انٹرویو تھا اسی روز موسیقی کانفرنس بھی شہر میں منعقد ہونی تھی تو انہوں نے انٹرویو پر موسیقی کو ترجیح دی۔ احمد بشیر لکھتے ہیں:

"خواجہ خورشید انور کھلے ذہن کے مالک تھے اور ان کی دلچسپیاں بہت سے میدانوں
میں تھیں۔ وہ فلسفی اور فلسفہ دان تھے شاعر تھے موسیقی کا نظری علم رکھتے تھے۔ فلم
سکرپٹ لکھتے تھے اور فلم ڈائریکٹر تھے۔ مگر سب سے بڑھ کر وہ ایک موسیقار تھے"۔(۴۲)

اس خاکے کی دولت ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ خورشید انور نے فلمی گانے اور کلاسیکی موسیقی کا البم بھی تیار کروایا تھا۔ احمد بشیر موسیقی کے حوالے سے بھی معلومات رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ خاکے میں انہوں نے شخصیت نگاری کے ساتھ موسیقی کے حوالے سے بھی بڑی باریک بنی سے وضاحت کی ہے۔

چھپن چھری: کشور ناہید:

احمد بشیر کے تمام خاکوں میں ان کے بے باکی، بر جستگی اور سچائی نظر آتی ہے۔ اور ایسی بے باکی اور بے تکلفی سے انہوں نے کشور ناہید پر خاکہ "چھپن چھری" لکھا اس خاکے کا نام پہلے "گشتی" تھا احمد بشیر نے اس خاکے میں مشہور کالم نگار، خود نوشت، سوانح نگار اور شاعرہ کشور ناہید کو تمام خامیوں وخوبیوں کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے بیان کر دیا ہے۔ کشور ناہید کی شخصت کے پوشیدہ گوشوں کو بیان کر دیا ہے۔ اس خاکے پر احمد بشیر نے دو ضمیمے بھی لکھے۔ کشور ناہید کی شخصیت روایتی عورت سے ہٹ کر تھی۔ خود کو بری عورت سمجھتی اور ظاہر کرتی تھیں۔ احمد بشیر لکھتے ہیں:

> "وہ جس سے دوستی کرنا چاہتی ہے اس کو مختلف طریقوں سے اشتعال دلاتی ہے اور سو جتن کرتی ہے تا کہ وہ اس سے چڑ جائے نفرت کرے اور گالیاں دے اس میں کامیاب نہ ہو سکے تو وہ بے چین ہو جاتی ہے۔ پھر دوسرے سے کرید کرید کر پوچھتی ہے میرے بعد کس نے کیا کہا تھا؟ وہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی محفل اس پر ملامت کئے بغیر اٹھ جائے وہ مشاہیر کو برا کہتی ہے بڑوں کے سوانگ بھرتی ہے چھوٹوں کو چمکار چمکار کر گستاخی پر ابھارتی ہے"۔(۴۳)

کشور کے بارے میں بے تکلفی کے بغیر لکھنا ممکن نہ تھا۔ آخر وہ کوئی نیک پروین تو نہ تھی۔ احمد بشیر کے اس خاکے کے بعد کشور ناہید ان سے تقریباً دو برس ناراض رہیں لیکن پھر معاملات بہتر ہوگئے لیکن اس خاکے کو بہت مقبولیت ملی اس خاکہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کشور نسانیت کی ترجمان تھیں احمد بشیر نے اس خاکے کو پہلے "گشتی" کا نام دیا تھا۔ جسے بعد میں یونس جاوید نے نیلم احمد بشیر کے کہنے پر اس کا نام "چھپن چھری" رکھا۔ اس خاکے کی بدولت یہ

بھی لگتا ہے کہ کشور کی شخصیت خوبیوں سے زیادہ خامیوں کی پیکر تھی اور ان خامیوں کو احمد بشیر نے سچائی سے اس خاکے میں بیان کر دیا ہے۔ احمد بشیر لکھتے ہیں:

"اگر آپ کشور ناہید کو ذلیل کرنا چاہیں تو کہیں کہ وہ ایک خوش خلق، نیک چلن اور شریف خاتون ہے۔ وفاشعار ہے۔ عجز و انکسار کا پیکر ہے۔ ایثار اس کا شیوہ ہے۔ وہ کسی کا دل نہیں توڑتی۔ سب کی عزت کرتی ہے اور معاشرے کی کوئی روایت نہیں توڑتی کیونکہ وہ ایک مشرقی خاتون ہے اور تقدس مشرق پر یقین رکھتی ہے"۔(۴۴)

"مگر میں تو اسے خوش کرنا چاہتا ہوں اس لئے میں کہتا ہوں کہ وہ بڑی ذلیل عورت ہے سنگدل ہے، چھوٹوں کو تھپڑ مارتی ہے بڑوں کے آگے گھوڑی بن جاتی ہے۔ وہ انتہائی دنیا دا ر ہے ہر قیمت پر آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ اس کی کہنی سیمنٹ کی بنی ہوئی ہے۔ وہ سسٹم کو خوب سمجھتی ہے"۔(۴۵)

احمد بشیر کے اس خاکے کے بعد انہیں کافی بایں سننی پڑیں لیکن ان کا یہ خاکہ بہت مشہور ہوا اور اعلیٰ خاکوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ کیونکہ خاکہ نگاری کا یہی اصول ہے کہ شخصیت کے بارے میں پوری سچائی اور غیر جانبدارانہ طور پر تمام خوبیاں اور خامیاں بیان کر دی جائیں اور یہ فن احمد بشیر کے اس خاکے میں بھرپور نظر آتا ہے۔

احمد بشیر لکھتے ہیں:

"کشور ناہید ایک لذیذ عورت ہے جس نے اسے نہیں جانا اس نے عورت کے بارے میں کچھ نہیں جانا۔ ان دنوں وہ اسلام آباد میں تعینات ہے اور اسلام آباد کے ملکھے جنگلوں میں ایک چنگاری ڈال کر لاہور خود اداس ہو گیا ہے"۔(۴۶)

فری لانسر: عبد المجید بھٹی:

زندگی کو بھرپور طریقے سے گزارنے والے عبد المجید بھٹی پر لکھے گئے خاکہ کو احمد بشیر نے فری لانسر کا نام دیا ہے۔ اس خاکے میں عبد المجید کی شخصیت کو قاری کے سامنے واضح کی گئی ہے۔ کہ وہ کیسی طبیعت کے مالک تھے۔ ظلم و زیادتی برداشت نہیں کرتے تھے۔ باتوں کے شوقین تھے اور آئین و قانون سے واقف تھے۔ نظم بھی لکھتے تھے اور ناول بھی انہوں نے پنجابی میں پہلا ناول لکھا لیکن وہ چھپ نہ سکا۔ ریڈیو کے لیے فیچر بھی لکھے تھے۔ اس خاکے میں ان کی صحافتی خصوصیات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ احمد بشیر لکھتے ہیں:

> "اس کا رہن سہن بہت انوکھا تھا۔ وہ سوٹ پہنتا اور نکٹائی لگاتا تھا وہ سر پر سولا ہیٹ پہنتا تھا اور پیدل ہی چلتا تھا۔ اس زمانے میں تانگہ آٹھ آنے میں سواری کو کہیں سے کہیں لے جاتا تھا اور آٹھ آنے بھٹی کے پاس بالعموم ہوتے تھے"۔(۴۷)

عرب ہوٹل پر ادیب، سیاستدان، دانشور کا گھنٹوں بیٹھنا اور باتیں کرنا سب کا ذکر اس خاکے میں موجود ہے۔ بھٹی صاحب کا انداز گفتگو نہایت مہذب تھا۔ کبھی غصے میں بھی سلیقے کو ہاتھ نہ جانے دیتے۔ اپنی بات پر ڈٹے رہتے اور اپنی بات کو مکمل کیے بغیر نہ رکتے۔ اپنے کلام کو یار چار اپنے دوستوں کو سناتے اور داد وصول کرتے۔ احمد بشیر لکھتے ہیں۔

> "بھٹی ہمیشہ کھلا ہوا رہتا۔ وہ دکانداروں سے آنکھیں چار کرتا اور حال چال پوچھتا۔ اس نے کبھی دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میری آمدنی غیر یقینی اور قلیل ہے۔ وہ رکھ رکھاؤ کا قائل تھا۔ اس نے کبھی گھٹیا بات نہیں کی۔ اسے بہت زیادہ غصہ آتا تو بھی وہ غیر مہذب لفظ منہ سے نہ نکالتا۔ میں نے کئی برس اس کے ساتھ گزارے۔ میں نے اس

کی تیوری چڑھی ہوئی نہیں دیکھی۔اسے اپنا کلام سنانے کا بڑا شوق تھا اور اپنی ایک نظم وہ کئی کئی بار سنا تا اور ہر مصرعے پر داد طلب نگاہوں سے سننے والے کو دیکھتا۔اپنے انداز سے وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ سننے والا بے دھیان ہو جائے۔وہ مصرعے دو دو تین تین بار پڑھتا اور ہر مصرعے کی دو دو تین بار دا د لیتا"۔(۴۸)

بھٹی صاحب کا کاتب سے شاعر تک کا سفر ، پنجابی اور پنجاب سے ان کی محبت ، بیوی بچوں سے ان کی شفقت اور بد نظمی میں بھی ان کا رویہ یہ کبھی دوسروں سے خراب نہ ہو تا۔ بلکہ کھلے دل سے پرانی باتوں کو بھلا دینا اور زندگی کو بھر پور طریقے سے گزارنا سب کا ذکر اس خاکے میں ملتا ہے۔

"عبدالمجید کا آخری وقت آیا تو وہ یوں گیا جیسے پھول میں سے خوشبو جائے"۔(۴۹)

موچھا:بریگیڈئیر عاطف:

اپنی ہی ذات میں مگن اپنے خول میں رہنے والے بریگیڈئیر عاطف پر لکھے گئے خاکے کو احمد بشیر نے موچھا کا نام دیا ہے ئ۔ جس سے ان کی شخصیت کا ابھر کر سامنے آ جاتی ہے ئ۔ اس خاکے میں احمد بشیر نے اپنے بہنوئی کی شخصیت کے چند پہلوؤں کو بیان کر کے ان کی پوری شخصیت کی تصویر کشی کر دی ہے۔ آغاز خاکہ میں اپنی بہن پروین کی خوبصورتی کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا ہے اس کا کچھ حصہ درج میں ذیل ہے:

"پروین میری بہن اس زمانے میں ایم اے میں پڑھتی تھی اور لاہور میں رہتی تھی۔وہ ایسی حسین لڑکی تھی کہ میں اس کا بھائی ہو کر چوری چوری اس کی طرف دیکھتا اور سوچتا اللہ میاں تو نے یہ بت کسی فرصت کی گھڑی میں گھڑا ہو گا۔یہ چاند ہمارے صحن میں کیسے اتر آیا۔ پروین کے نین کا جل بن کا لئے اس کی کلائیاں گجروں بنا مہکتیں، اس کے

رخساروں کے گرد بھورے منڈلاتے۔اب اس نیلیے گنبد کی ساری ٹائلیں اکھڑ چکی ہیں۔مگر چھتر کی گولائی پر ابھی چاندنی چٹکتی ہے۔وہ اردو کی صاحب طرز ادیب ہے مگر بد خط ہے اس لئے کم لکھتی ہے۔لکھتی ہے تو عاطف کے لئے جس نے اس کی کوئی تحریر کبھی نہیں پڑھی۔اس کی کتاب چھپی تو اس نے الماری میں رکھ دی"۔(۵۰)

عاطف کی شخصیت میں موجود خامیوں اور خوبیوں کو احمد بشیر نے بڑی سچائی اور برجستگی سے بنا کسی ڈر کے بیان کر دیا ہے۔بریگیڈیئر عاطف کا اپنی ذات،رعب اور خول میں رہنا ان کی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ سلوک / روایہ اپنی ماں سے محبت اور حب وطنی کو بڑی سلاست / سادگی سے بیان کیا ہے۔احمد بشیر لکھتے ہیں۔

"عاطف میں پری میٹو آدمی کی کھردری جبلت اس کی ذہنی روشنی کے باوجود چھپلی نہیں جاسکی وہ جب اپنے اندر کی سیڑھیاں اترتا ہے تو ایک گھنے بالوں والا جنگلی انسان بن جاتا ہے جس نے اپنے موچھے سے ابھی ابھی کوئی گینڈا مارا ہو۔پھر وہ اکیلا بیٹھ کر گینڈے کی کھال اتارتا ہے۔اس کے گوشت کے پارچے بناتا ہے اور پھر ان کو دوسروں میں تقسیم کر دیتا ہے۔باہر آتا ہے تو اس کے قیمتی سوٹ پر خون کا کوئی دھبہ نہیں ہوتا۔اس کے ناخن صاف ہوتے ہیں اور ہاتھ میں ۲۶ اونس کی ہاکی پکڑی ہوتی ہے"۔(۵۱)

"عاطف ایک مغرور آدمی ہے وہ کسی کے آگے جھکتا نہیں۔وہ کسی افسر سے ملتا نہیں۔وہ کوئی غلط بات نہیں سنتا۔وہ کسی کی سفارش نہیں مانتا۔وہ ایک سچا آدمی ہے اور اپنے سچ کو حرف آخر سمجھتا ہے۔پھر اس سچ کی حفاظت کے لئے ڈٹ جاتا ہے۔اس غرور کی وجہ سے اس نے زندگی میں بہت مار کھائی۔وہ ایک بہادر شخص بھی ہے۔وہ موت سے

نہیں ڈرتا۔وہ ایک حد تک تو ہم پرست آدمی بھی ہے۔جیسے پری میٹو انسان ہوتا تھا یا پھر جو کچھ اسے نظر آتا ہے دوسروں کو نظر نہیں آتا"۔(۵۲)

اس خاکے میں احمد بشیر کے بہنوئی کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی بہن پروین عاطف کی شخصیت کے چند پہلوؤں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔

اس طرح رنگ پور میں جب عاطف ار اس کے ساتھی محصور تھے۔ اور ہندوستانی افواج اور پاکستانی افواج کے درمیان جنگی ماحول تھا۔ بریگیڈ ئیر عاطف نے اپنی حاضر دماغی سے تمام امور کو سرانجام دیا۔اس کے علاوہ ہاکی کے میدان میں اس کی مہارت کاذکر بھی اس خاکہ میں ملتا ہے۔

عاطف کے مزاج میں ہر طرح کارنگ پایا جاتا ہے کہیں ضد، کہیں حساس، رحم دل تو کہیں ہے جس غرور، خود پسند اور اکیلا شخص غرض عاطف کی شخصیت کے یہ تمام پہلو احمد بشیر نے اس خاکے میں بیان کر دیے ہیں۔ جس سے عاطف کے شخصیت قاری پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ احمد بشیر لکھتے ہیں۔

"عاطف کا مزاج کھلاڑی کا ہے۔جبلت مزدور کی سی۔احساسات مشین کے سے۔اور پلاننگ کمپیوٹری۔وہ ایک ایسا کامیاب آدمی ہے جس کی جذباتی زندگی ایک طرف بھر پور دوسری طرف سے خالی ہے۔ایسے آدمی کو دور سے دیکھو تو ہا کی ہے نزدیک آؤ تو موچھا ہے"۔(۵۳)

حواشی:

۱۔ جو ملے تھے راستے میں، ص، ۵۷

۲۔ ایضاً، ص۵۷

۳۔ ایضا، ص، ۵۷

۴۔ ایضاً، ص، ۶۴

۵۔ ایضاً، ص۶۲

۶۔ ایضاً، ص، ۶۴

۷۔ ایضا، ص۶۴

۸۔ ایضا، ص، ۶۷

۹۔ ایضاً، ص۶۷

۱۰۔ ایضاً، ص۷۲

۱۱۔ ایضاً، ص۷۷

۱۲۔ ایضا، ص، ۸۲

۱۳۔ ص، ۸۷

۱۴۔ ایضاً، ص،۸٦

۱۵۔ ایضاً، ص، ۸۹

۱٦۔ ایضا، ص، ۹۴

۱۷۔ ایضا۔ ص، ۹۵

۱۸۔ ایضاً۔ ص، ۹٦

۱۹۔ ایضاً۔ ص، ۹۸

۲۰۔ ایضا، ص، ۱۰۸

۲۱۔ ایضا۔ ص، ۱۰۹

۲۲۔ ایضاً، ص، ۱۱۱

۲۳۔ ایضا، ص، ۱۱۲

۲۴۔ ایضاً، ص، ۱۲۴

۲۵۔ ایضا، ص، ۱۳۰

۲٦۔ ایضاً، ص، ۱۳۲

۲۷۔ ایضا، ص، ۱۳۳

۲۸۔ ایضاً، ص، ۱۴۰

۲۹۔ ایضاً، ص، ۱۴۴

۳۰۔ ایضاً، ص، ۱۵۳

۳۱۔ ایضا، ص، ۱۹۸

۳۲۔ ایضا

۳۳۔ ایضا، ص، ۱۸۴

۳۴۔ ایضاً، ص، ۱۶۳۔۱۶۴

۳۵۔ ایضاً، ص، ۱۷۰

۳۶۔ ایضا، ص، ۱۸۶

۳۷۔ ایضاً، ص، ۱۸۷

۳۸۔ ایضاً، ص، ۱۹۰۔۱۹۱

۳۹۔ ایضا، ص، ۱۵۴

۴۰۔ ایضاً، ص، ۱۵۵

۴۱۔ ایضاً، ص، ۱۵۱

۴۲۔ ایضاً، ص، ۱۵۹

۴۳۔ ایضا، ص، ۲۰۱

۴۴۔ ایضاً، ص، ۲۱۱

۴۵۔ ایضاً، ص، ۲۱۲

۴۶۔ ایضا، ص،۲۱۳

۴۷۔ ایضا، ص، ۲۱۵

۴۸۔ ایضاً، ص، ۲۱۶

۴۹۔ ایضاً، ص، ۲۱۴

۵۰۔ ایضا، ص، ۲۲۲

۵۱۔ ایضاً، ص، ۲۲۴

۵۲۔ ایضاً، ص، ۲۲۷

۵۳۔ ایضاً، ص، ۲۳۲

باب چہارم

احمد بشیر کا اندازِ تحریر:

احمد بشیر کی خاکہ نگاری اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے، ان کی کتاب "جو ملے تھے راستے میں" (مرتب: یونس جاوید) ۱۵ خاکوں کا مجموعہ ہے، جو مختلف شخصیات جیسے ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، میرا جی، احسان دانش، مولانا حسرت موہانی، ظہیر کاشمیری، اور کشور ناہید پر مبنی ہیں۔ یہ خاکے احمد بشیر کی زندگی میں ملنے والے لوگوں کی شخصیتوں کو ذاتی مشاہدات، انٹرویوز اور تاثرات کی بنیاد پر پیش کرتے ہیں۔

احمد بشیر کا اندازِ تحریر حقیقت کی خوبیوں اور کمزوریوں کو متوازن طور پر اجاگر کرتا ہے۔ وہ اپنے خاکوں میں خود بھی شامل ہوتے ہیں، جس سے خاکے مزید جان دار اور واضح ہو جاتے ہیں۔

احمد بشیر کا انداز حقیقت پسندی، مزاح اور تنقید کا امتزاج ہے۔ وہ شخصیت کو صرف تعریف کی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ ان کی اندرونی پیچیدگیاں، تضادات اور سماجی پس منظر کو بھی کھولتے ہیں، ان کا انداز شگفتہ ہے، یعنی سنجیدگی میں مزاح شامل ہوتا ہے۔ جس سے شخصیت کی گہرائی قاری پر واضح ہو جاتی ہے۔

احمد بشیر نے اپنے خاکوں میں نہایت باریک بینی سے مشاہدات کی بنا پر شخصیت نگاری کی ہے۔ جس طرح سے انہوں نے ظاہری خدوخال، عمل اور لب و لہجہ بیان کیا ہے۔ اس سے خاکے کی شخصیت پوری طرح سے واضح ہو جاتی ہے۔

خاکہ "انٹرویو" میں احمد بشیر نے مولانا چراغ حسن حسرت سے انٹرویو کے لیے ہونے والی ملاقات کو بڑی باریک بینی سے خاکے میں بیان کیا ہے۔ جس سے ان کے مشاہدات کا اندازہ ہوتا ہے۔ احمد بشیر مولانا کے پاس اخبار میں ملازمت کی تلاش کے لیے گئے تھے۔ اس دوران مولانا کالم لکھنے میں مصروف تھے، ان کے خدوخال کی نہایت سلیقہ مندی سے تصویر کشی کی ہے۔

"میں نے بڑی آہستگی سے دروازے پر دستک دی پھر کواڑ کھول کر دبے پاؤں اندر داخل ہو گیا۔ کرسی پر مولانا چراغ حسن حسرت کے وجود سے بھری پڑی تھی دہرے تن و توش کے آدمی تھے۔ موٹی موٹی لال آنکھیں، کچھ اسی گھنی مونچھیں کشادہ پیشانی سر کے بال دونوں کانوں کے اوپر سیدھے کھڑے ہوئے۔ وہ ایک دیو ہیکل آدمی تھے۔ علم ان کے چہرے پر پسینے کی طرح رس رہا تھا"۔(۱)

خاکہ انٹرویو میں مولانا چراغ حسن حسرت کے اندازِ گفتگو کو ان الفاظ میں رقم طراز کیا ہے۔

"علم کا لہجہ دھیما آواز پاٹ دار اور زبان اردو تھی۔ علم کے الفاظ کھینچ جاتے تھے جیسے کوئی گویا تان کہے۔ جیسے کوئی لے پر پورا اترے جیسے کوئی ہم پر آئے۔ علم کے لہجے میں دھمکی بھی تھی اور فریاد بھی"۔(۲)

احمد بشیر ناول نگار بھی تھے ان کا یہ انداز خاکوں میں بھی دیکھنے کو ملتا جس طرح سے وہ تسلسل سے واقعات کو بیان کرتے ہیں خاکوں میں لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ احمد بشیر کے اپنی ذاتی زندگی اور ادبی زندگی دونوں میں سچائی اور حق کا راستہ کبھی نہیں چھوڑا انہوں نے ہمیشہ اپنا کام خلوص سے سر انجام دیا ہے۔ انہوں نے ادبی اور صحافتی زندگی میں بڑی بے باکی سے کام لیا ہے۔ خاکہ "انٹرویو" میں انہوں نے جیروم کے جیروم کے ترجمے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ

جیروم کے جیروم نے امتیاز علی تاج سے سرقہ کیا ہے اور اس میں حوالہ بھی نہیں دیا۔ تو اس پر مولانا چراغ حسن حسرت مسکرادیے مولانا نے اگرچہ احمد بشیر کے لہجے اور سچ بیانی سے لطف لیا مگر کہا کہ:

"سید صاحب ہمارے دوست ہیں۔ خیال رہے مولانا میں دوستوں پر طنز سننا پسند نہیں کرتا"۔

(۳)

احمد بشیر کے خاکوں میں سادگی، روانی، بے تکلفی، بے باکی اور سچائی کے مظاہر صاف دکھائی دیتے ہیں۔ احمد بشیر اور مولانا چراغ حسن حسرت کی گفتگو مکالماتی انداز ظاہر کرتی ہے۔ جس میں احمد بشیر کی اندازِ گفتگو اور بے تکلفی نظر آتی ہے۔

"بمبئی میں آپ کیا کرتے تھے؟

آوارہ گردی

اور اس سے پہلے

آوارہ گردی۔۔۔ کلکتے میں، دہلی میں، الہ آباد میں، پٹنہ میں، بنارس میں، آسام کی ترائی میں کچھ روز جنگلی ہاتھی پکڑنے والوں کے ساتھ جنگلوں میں پھرتا رہا"۔(۴)

احمد بشیر کی شخصیت کا ایک پہلو خاکے "قلندر" سے سامنے آتا ہے کہ بے شک وہ نڈر، بے باک اور بے تکلف انسان تھے لیکن انہیں چھوٹے بڑے کی تمیز تھی۔ انہوں نے حسرت موہانی کا جو انٹریوں کیا وہ نہایت سلیقے، تمیز اور دلچسپ انداز میں سرانجام دیا۔ اور پھر اسے بڑی روانی، سادگی اور خوبصورت انداز میں بیان کر دیا کہ حسرت موہانی کی شخصیت قاری کے سامنے ہوبہو آجائے اس کی ایک مثال کچھ یوں ہے کہ:

"فرمانے لگے۔ علی گڑھ کی زندگی بری دلچسپ تھی اور میں نے اس زندگی سے بڑا لطف اٹھایا۔ لیکن کالج کا زمانہ تو سبھی لوگوں کا یادگار ہوتا ہے"۔(۵)

خاکہ نگاری کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس شخصیت پر خاکہ لکھا جائے اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں کو غیر جانبدارانہ طور پر قاری کے سامنے پیش کر دیا جائے اور یہ خصوصیت احمد بشیر کے خاکوں میں ہمیں نظر آتی ہے۔ انہوں نے جیسے جس شخصیت کو پرکھا، مشاہدہ کیا، بلکل ویسے ہی خاکے میں بیان کر دیا۔ اس کی ایک مثال "میرا جی" کے خاکے "اکیلا" میں بھی نظر آتی ہے۔

"میرا جی لذت کا غلام تھا۔ وہ جوانانیت سے حاصل ہوتی ہے۔ اس نے اپنے شبستان عیش کے دروازے صرف اپنی ذات ہی پر کھولے تھے اور کسی کو اس میں جھانکنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ دنیا کے جھمیلوں سے بے نیاز اپنی ذات میں چھپ کے چوری چوری لذت لیتا رہا۔ اس نے ساری زندگی اپنی ذات کی بندگی میں گزاری اس نے کبھی اپنے آقا کو ناراض نہیں کیا۔ اس کا یہ جذبہ اپنا قومی اور خود مختار تھا کہ وہ خود اپنی تسکین بن جاتا تھا اور خارجی ذرائع کی ضرورت کا احساس بھی پیدا نہ ہونے دیتا تھا اس نے پوری عمر انسانوں کے بھرے جنگل میں گزاری۔ مگر خود ایک بے برگ و بار درخت بن کر الگ کھڑا رہا اس کو اس بات کا بھی ملال نہیں تھا کہ زرد کانٹوں کی نوکوں پر پتیاں نہیں اگ سکتیں اور کوئی اس ٹھوہر کے سائے میں نہیں بیٹھ سکتا۔ اسے اپنی انا سے فرصت کہاں تھی کہ وہ اوروں کا غم کھاتا۔ وہ اپنے خول سے کبھی باہر نہ نکل سکا۔ اس شبستان عیش کے خول میں ساری عمر اس نے اپنے آپ کو قید رکھا۔ اس کا کوئی دوست کوئی بہن بھائی کوئی ماں باپ نہیں تھا۔ وہ

بلکتے ہوئے کبھی اپنی ذات ہی سے لپٹ لیتا اور کبھی بے چین عاشق کی طرح اپنی انا کے زانو پر سر رکھ کر سو جاتا"۔(۶)

احمد بشیر نے جس طرح سے جس خاکے میں احسان دانش کا انداز گفتگو بیان کیا ہے اس سے احمد بشیر کی باریک بینی کا اندازہ ہوتا ہے کہ احسان دانش کا یہ انداز پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے آجاتے۔

"احسان دانش چبا چبا کر باتیں کرتا ہے اور باتوں کے دوران میں آپ کے ہاتھوں اور بازوؤں کو جذبات کے زیر و بم کے مطابق چھوتا، پکڑتا دباتا اور چھوڑتا رہتا ہے اس کی یہ حرکات اختیاری نہیں اسے ان کے سرزد ہونے تک کا شعور نہیں اسے کبھی محسوس نہیں ہوتا کہ وہ اپنی پیلی پیلی آنکھوں کو جلد جلد گھما رہا ہے۔اب وہ نظروں سے اشارے کر رہا ہے اب وہ اپنے ہاتھوں کی حرکت اور اپنی آواز کے زیر و بم سے بات میں ڈرامہ گھول رہا ہے آپ کو شدت کے ساتھ متوجہ کر رہا ہے آپ کو شدت کے ساتھ متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے"۔(۷)

احمد بشیر نے میراجی کی پراسرار شخصیت کو مزاحیہ اور تنقیدی انداز میں پیش کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

"میراجی کو اس بات سے بہت تسکین ہوتی تھی کہ لوگ اسے پراسرار سمجھیں۔ پراسرایت کے جنون میں وہ عجیب عجیب حرکتیں کیا کرتا تھا"۔(۸)

ایک اور جگہ:

"اس نے پوری عمر انسانوں کے بھرے جنگل میں گزاری۔ مگر خود ایک بے برگ و بار درخت بن کر الگ کھڑا رہا اس کو اس بات کا بھی ملال نہیں تھا کہ زرد کانٹوں کی نوکوں پر پتیاں نہیں اگ سکتیں اور کوئی اس تھوہر کے سائے میں نہیں بیٹھ سکتا"۔(۹)

یہ استعاراتی انداز شخصیت کی تنہائی کو حیرت انگیز طور پر بیان کرتا ہے

احمد بشیر کے خاکے ذاتی تجربات، انٹرویوز اور مختصر ملاقاتوں پر مبنی ہے۔ وہ خاکے تاثرات کی بنیاد پر لکھتے ہیں۔ یہ طریقہ کار ان کی صحافتی پس، منظر سے جڑا ہے۔ جہاں وہ شخصیت کی زندگی کے منتخب واقعات کو چنتے ہیں جو ان کی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔

احمد بشیر کی زبان سادہ، سلیس اور براہ راست ہے، جو عام فہم ہے مگر استعاراتی اور برجستہ، اور کہیں کہیں طنز و مزاح بھی نظر آتا ہے۔ اس کی ایک مثال ذیل میں درج ہے۔

"ظہیر کی زندگی کا بنیادی جذبہ رعب ڈالنا، شعبدے دکھانا اور حیران کرنا ہے، وہ جس محفل میں جاتا ہے ایسی حرکتیں کرتا ہے جنہیں دیکھ کر محفل والوں کے منہ سے بے ساختہ "ہائیں" نکل جائے"۔(۱۰)

احمد بشیر نے خاکوں میں خالص اردو کا استعمال کیا ہے مختصر جملوں میں اپنی بات کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ شخصیتوں پر لکھے گئے خاکوں میں ظاہری خدوخال کے ساتھ اندرونی تضادات کو بھی بیان کیا گیا ہے جو کہ احمد بشیر کے مشاہدات کو ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے جن شخصیات پر خاکے لکھے وہ انہیں خوب جانتے تھے ان کی عادتوں،

رہن سہن، معاملات کے ساتھ ساتھ ان کی اندرونی کشمکش کو بھی جانتے تھے جس سے احمد بشیر نے شخصیت کی مکمل تصویر کشی خاکے میں کی ہے جس سے شخصیت کی جیتی جاگتی صورت قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ایک مثال خاکہ "موچھا" میں نظر آتی ہے جہاں احمد بشیر نے بریگیڈیئر عاطف کی شخصیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"عاطف کا مزاج کھلاڑی کا ہے، جبلت مزدور کی سی، احساسات مشین کے سے، اور پلاننگ کمپیوٹر سی۔
وہ ایک ایسا کامیاب آدمی ہے جس کی جذباتی زندگی ایک طرف بھرپور دوسری طرف سے خالی ہے"۔
(۱۱)

جو بشیر کے خاکے پڑھتے ہوئے خاکے کی تحریر میں صاحب خاکہ کی شخصیت، حلیہ اور واقعات کی صورت بنتی محسوس ہوتی ہے اور انسان خود اس منظر کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ جس سے واقعات بھی آسانی سے سمجھ آجاتے ہیں۔ احمد بشیر کے خاکوں میں طوالت اور تفصیلات ہیں۔ اس کی ایک مثال قدرت اللہ شہاب پر لکھا گیا خاکہ "پیر و مرشد" ہے۔ جس میں قدرت اللہ شہاب کے علاوہ دیگر لوگوں کا ذکر بھی شامل ہے جو خاکے کو طویل کرتا ہے۔

احمد بشیر کے خاکوں میں ایک خاصیت ان کے عنوان کے انتخاب کی صورت میں بھی سامنے آتی ہے۔ خاکے کا عنوان احمد بشیر نے صاحب خاکہ کی شخصیت کو سمیٹ کر ایک لفظ میں قید / بیان کر دیا ہے۔ خاکوں کا آغاز صاحب خاکہ کے اصل نام سے نہیں بلکہ ان کی شخصیت کے حساب رکھے گئے نام سے ہوتا ہے۔ جیسے احسان دانش کا خاکہ "جپسی" کشور ناہید پر لکھا گیا خاکہ "چھپن چھری" بریگیڈیئر عاطف پر لکھا گیا خاکہ "موچھا" وغیرہ۔

احمد بشیر ایک فلم ساز بھی تھے۔ اس لیے ان کے خاکوں میں بھی یہ خاصیت نظر آتی ہے۔ وہ واقعات کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ جیسے کوئی ڈرامہ یا فلم میں ایک سین کے بعد دوسرا سین شروع ہو جاتا ہے۔ جس سے خاکے میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ ایک منظر ملاحظہ ہو۔

"بڑے بڑے سرکاری دفتروں کے آس پاس بڑے بڑے افسروں کے کمرے کے سامنے پڑے ہوئے بینچ پر چپڑاسی سے دبی آواز میں باتیں کرتے ہوئے مزنگ کے کسی تنور پر ٹاٹ کے ٹکڑوں پر اکڑوں بیٹھے ہوئے سڑکوں کے کنارے چلتے ہوئے بحالیات کے افسر کے دفتر کے سامنے سر کھجاتے، پیسہ اخبار سٹریٹ میں کسی قہوہ خانے کے دروازے پر جھانکتے ہوئے آپ نے اسے کہیں نہ کہیں ضرور دیکھا ہوگا"۔(۱۲)

احمد بشیر نے خاکوں میں جہاں شخصیات کی خامیوں کا ذکر کیا ہے وہیں انہوں نے صاحب خاکہ میں موجود خوبیوں کو بھی بیان کیا ہے۔ خاکوں میں متوازن طور پر خامیوں اور خوبیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ صرف صاحب خاکہ ہی نہیں بلکہ احمد بشیر نے کہیں کہیں اپنی خامیوں کا بھی ذکر کیا ہے جس سے ان کی صداقت اور سچائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

"عاطف ایک مغرور آدمی ہے وہ کسی کے آگے جھکتا نہیں۔ وہ کسی افسر سے ملتا نہیں۔ وہ کوئی غلط بات نہیں سنتا۔ وہ کسی کی سفارش نہیں مانتا۔ وہ ایک سچا آدمی ہے اور اپنے سچ کو حرف آخر سمجھتا ہے۔ پھر اس سچ کی حفاظت کے لئے ڈٹ جاتا ہے۔ اس غرور کی وجہ سے اس نے زندگی میں بہت مار کھائی۔ وہ ایک بہادر شخص بھی ہے۔ وہ موت سے نہیں ڈرتا۔ وہ ایک حد تک تو ہم پرست آدمی بھی ہے۔ جیسے پری میٹو انسان ہوتا تھا یا پھر جو کچھ اسے نظر آتا ہے دوسروں کو نظر نہیں آتا"۔(۱۳)

"اگر کہیں مولانا چراغ حسن حسرت کو اکیلے چائے پینے کی عادت ہوتی اگر مجھے اہم کام مصبح سویرے نمٹانے کا سلیقہ آتا یا اگر مجھے راگ دیس کے سروں کا برتاوا معلوم نہ ہوتا تو شاید میں کبھی اخبار نویس نہ بن سکتا۔اس کوچے میں مجھے ممتاز مفتی نے بھیجا تھا۔ اسے خود معلوم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔وہ چاہتا تھا کہ میں کسی بڑے ہجوم میں گھس کر زندگی کا راستہ تلاش کرلوں یا گم ہو جاؤں"۔(۱۴)

خاکوں میں شخصی خاکہ نگاری کے ساتھ اس دور کی سیاسی کشمکش بھی نظر آتی ہے۔احمد بشیر نے خاکوں میں بڑی سچائی اور بے باکی سے لکھا اور اس کی پرواہ بھی نہیں کی کہ بعد میں کیا ردعمل ہو گا۔کشور ناہید کا خاکہ "چھپن چھری" ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔

"کشور ناہید پہلی نظر میں مجھے نہایت بدتمیز لڑکی لگی تھی۔۔۔۔اس کے گرد دھمال ناچنے لگتے ہیں ڈاکٹر انور سدید: قدرالله شہاب، کشور ناہید، خواجہ خورشید انور، ممتاز مفتی اور چراغ حسن حسرت کے خاکے میں نے رسائل میں پڑھے تو احمد بشیر کی قلندرانہ جرات کی داد دی"۔(۱۵)

احمد بشیر نے خاکوں میں صاحب خاکہ کے حلیے اور چہرے کے خدوخال اس انداز میں بیان کیے ہیں کہ جس نے اس خصیت کو نہیں بھی دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بھی صاحب خاکہ کی ایک محترک تصویر واضح ہو جاتی ہے۔

ظہیر کاشمیری کا حلیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کے خدو خال میں ایک گولائیوں بھر انظام ہے۔چہرہ چھلا ہوا ناک مڑی ہوئی دانت چوہے کی طرح کیلئے آنکھیں بھوری اور اندر کو بیٹھی ہوئیں، ہونٹ پتلے اور کمان کی

طرح اندر کو جھکے ہوئے رخساروں پر چیچک کے گھلے گھلے داغ جو دور سے دکھائی نہیں دیتے۔لہریا بالوں اور مخروطی داڑھی کا رنگ میلے اور پرانے خون سے مشابہ "۔(۱۶)

احمد بشیر نے جس شخصیات کو خاکے کے لیے چنا، ان لوگوں سے احمد بشیر کا کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح سے واسطہ رہا ہے۔ یہیں وجہ ہے کہ احمد بشیر صاحب خاکہ کی زندگی سے واقفیت رکھتے تھے۔ جن لوگوں کے احمد بشیر نے خاکے لکھے ان کے معاملات زندگی سے واقف تھے او ان کی ظاہری و باطنی خامیوں اور خوبیوں کو بھی جانتے تھے یہی وجہ ہے کہ خاکہ پڑھتے وقت صاحب خاکہ کی پوری شخصیت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ احمد بشیر کے خاکوں سے نہ صرف شخصیت سے آگاہی ہوتی ہے بلکہ اس وقت کے ادبی و سیاسی دور کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

انہوں نے اپنے خاکوں میں ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، سیاست دانوں، دانوروں کو شامل کیا۔ میراجی کو تنہائی پسند، آزاد خیال ور رومانوی شاعر کے طور پر پیش کیا گیا۔ احسان دانش کو سادہ دل اور درویش مزاج اور دوست کے روپ میں دکھایا، ممتاز مفتی کے خاکے میں ان کی فکری الجھنوں، روحانی تبدیلیوں کا ذکر آیا۔ کشور ناہید کو بے باک، روشن خیال اور زبان کی تیز شخصیت کے طور پر پیش کیا، وارث میر کے خاکے میں ان کی سچائی، حق گوئی، اور خبر کے خلاف جدوجہد کو سراہا ہے۔

اصغر ندیم سید:

"زندگی میں کئی مواقع آئے ہوں گے جب احمد بشیر کے قلم اور ضمیر کی ٹھیک ٹھا ک قیمت لگی ہوگی۔ مگر انھوں نے جہاں اپنی قیمت لگوانی تھی وہاں لگوائی آج وہ ایک

انصاف پسند اور صحت مند معاشرے کا خواب دیکھنے والوں میں سب سے آگے کھڑا ہے"

(۱۷)۔

سید نصیر شاہ:

"احمد بشیر کے متعلق یہی کہا جائے گا وہ سچ کی طرح کڑوا شخص تھا اس کے بہت سے دوست اس کے لفظوں سے بد ذائقہ ہوئے۔۔۔دو کھرا اشترا کی تھا اور اپنے نظریات میں کھراہی رہا۔اپنے موقع پرستانہ ترمیم پسندی سے ہمیشہ نفرت کی اور میں نفرت اسے نا قابل برداشت بن گئی"۔(۱۸)

عبدالقادر حسن:

"احمد بشیر جو کہتا تھی وہ ویسا ہی تھا اور اس کی یہی غیر منافقانہ اور " کا فرانہ زندگی مجھے بہت عزیز تھی۔"(۱۹)

احمد عقیل روبی:

"جب بھی منہ سے کچھ کہا ہنگامہ برپا ہو گیا"۔(۲۰)

سرفراز سید:

"عشق کی ہو بہو تصویر کھینچنے والا ایک اور سچ بولنے والا شخص چلا گیا"۔(۲۱)

ان کی خاکہ نگاری کے حوالے سے طاہر اصغر لکھتے ہیں:

"احمد بشیر نے سب سے دلچسپ اور بے باکانہ خاکہ کشور ناہید کا لکھا ہے جس کا عنوان "چھپن چھری" ہے"(۲۲)

صاحب خاکہ کے متعلق مشاہدات اور احمد بشیر کا مطالعہ گہرا تھا۔

بقول اظہر جاوید:

"انہوں نے جو خاکے لکھے ان میں بھی بے ساختہ پن اور اس شخص (شخصیت) کا نہایت عمیق مطالعہ اور مشاہدہ شامل تھا"۔(۲۳)

حواشی:

۱۔ جو ملے تھے راستے میں، ص، ۵۷

۲۔ ایضاً، ص، ۵۷

۳۔ ایضاً، ص، ۶۰

۴۔ ایضاً، ص، ۶۰۔۶۱

۵۔ ایضا، ص، ۶۹

۶۔ ایضا، ص، ۷۹

۷۔ ایضاً، ص، ۱۰۱

۸۔ ایضاً، ص، ۸۶

۹۔ ایضاً، ص، ۷۹

۱۰۔ ایضاً، ص، ۱۱۳

۱۱۔ ایضا، ص، ۲۳۲

۱۲۔ ایضاً، ص،۹۱

۱۳۔ ایضاً، ص، ۲۲۷

۱۴۔ ایضاً، ص، ۵۷

۱۵۔ ایضا، ص، ۱۴۵

۱۶۔ ایضاً، ص، ۱۱۲

۱۷۔ شخصیت اور فن، ص، ۳۹

۱۸۔ ایضاً، ص، ۴۰

۱۹۔ ایضاً، ص، ۴۰

۲۰۔ ایضاً، ص، ۴۱

۲۱۔ ایضاً، ص،۴۱

۲۲۔ ایضا، ص، ۱۴۴

۲۳۔ ایضاً، ص، ۱۴۴

باب پنجم

تقابل:

احمد بشیر نے جن شخصیات پر قلم اٹھایا وہ خود بھی ادب کی دنیا میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں احمد بشیر نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر ان شخصیات پر خاکے لکھے اور کمال لکھے۔ ان کے خاکوں میں صاحب خاکہ کی شخصیت کو بڑے بھرپور انداز میں سچائی، بے باکی اور پر جستگی سے بیان کر دیا ہے۔ احمد بشیر نے صاحب خاکہ کی شخصیت کو چند اہم پہلوؤں، واقعات کی بنا پر صاحب خاکہ کو ظاہری اور باطنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ مختصر مگر جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ کہ صاحب خاکہ کی شخصیت ہمیں آنکھوں کے سامنے نظر آتی ہے۔ ان کے خاکے پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ہم ان شخصیات کو اچھے سے جان گئے ہیں۔ احمد بشیر کا انداز تحریر بھی دیگر خاکہ نگاروں سے مختلف اور منفرد ہے۔ ان کے خاکے اردو ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اس باب میں احمد بشیر کے چند خاکوں کا دیگر خاکہ نگاروں کے خاکوں سے تقابل کیا گیا ہے۔

احمد بشیر کی خاکہ نگاری کی خصوصیات یہ ہے کہ وہ شخصیت کو صرف تعریف یا طنز کی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کی اندرونی پیچیدگیاں، تضادات اور سماجی پس منظر کو بھی کھولتے ہیں۔ ان کا انداز صحافی حقیقت پسندیٰ اور فلماتی تکنیکوں سے بھرا ہے۔ اردو ادب میں احمد بیشر کا مقام ہمیشہ ایک سچے خاکہ نگار اور ایک نمایاں مقام رکھنے والے خاکہ نگار اور ایک نمایاں مقام رکھنے والے خاکہ نگار کے طور پر زندہ رہے گا۔

احمد بشیر کا خاکہ اکیلا اور شاہد احمد دہلوی کا خاکہ "میراجی" کا تقابل:

احمد بشیر (۱۹۲۳ء۔۲۰۰۴ء) اور شاہد دہلوی (۱۹۰۶ء۔۱۹۶۷ء) دونوں اردو ادب کے ممتاز خاکہ نگار ہیں، جنہوں نے میراجی (محمد ثناءاللہ ڈار ۱۹۱۲۔۱۹۴۹ء) کی پراسرار، ہٹّا اور ادبی شخصیت کو اپنے خاکوں میں بیان کیا ہے۔ احمد بشیر کا خاکہ "اکیلا" ان کی کتاب "جو ملے تھے راستے میں" کا حصہ ہے۔ جو میراجی کا حلیہ بیان کیا ہے۔ احمد بشیر لکھتے ہیں۔ احمد بشیر اور شاہد احمد دہلوی دونوں نے میراجی کی ظاہری شخصیت کو بیان کیا ہے۔ احمد بشیر اس ملاقات میں:

"میں نے میراجی کو اچھی طرح دیکھا۔ وہ وہی کھدر کی قمیض اور خاکی کا ڈرائے کی پتلون پہنے تھا۔ اس کا کالر میلا تھا۔ پتلون بہت بڑی تھی۔ جسے اس نے اوپر سے دوہرا کر کے ایک ٹائی سے کمر کے گرد باندھ رکھا تھا۔ کالر کا بٹن کھلا تھا جس میں سے اس کی جوگیوں والی مالا کے بڑے بڑے موتی جھانک رہے تھے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں دورو پہلے گولے تھے۔ بائیں ہاتھ کی منجھلی اور چھوٹی انگلی میں لوہے کے دوباریک چھلے تھے۔ بغل میں وہی بوسیدہ اخباروں کا بنڈل تھا۔ وہ ابھی نہا کے آیا تھا لیکن ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اسے نہائے ہوئے برسوں گزر چکے ہوں"۔(۱)

جب کہ شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

"میراجی بڑے گدے آدمی تھے۔ وہ ان میں سے تھے جو کہتے ہیں کہ یا نہلائے دائی یا نہلائیں چار بھائی۔ انہین کبھی کسی نے نہاتے نہیں دیکھا، بلکہ منہ دھوتے بھی نہیں دیکھا۔ بال کٹوانے کے بڑے چور تھے۔ وحشیوں کی طرح ہمیشہ بڑھے رہتے اور انمیں کبھی تیل نہ ڈالتے اور نہ انہیں بناتے"۔(۲)

شاہد احمد دہلوی کے خاکے میں ابتدائی ملاقاتوں ادبی کیریٹر، ظاہری شکل اور موت پر افسوس کیا گیا ہے جب کہ احمد بشیر کے خاکے میں میراجی کی روزمرہ کی زندگی کرشن چند کے گھر میں قیام، شراب کی لت، ادبی تضادات اور تنہائی کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ احمد بشیر اور شاہد احمد دہلوی دونوں نے میراجی کا خاکہ مختصر لکھا ہے۔ احمد بشیر کا خاکہ ۱۹ صفحات جب کہ شاہد احمد دہلوی کا خاکہ ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ دونوں کا خاکہ پڑھ کر میراجی کی شخصیت پر اسرار اور کن موجی، دلچسپ طبیعت کی حامل نظر آتی ہے۔

شاہد احمد دہلوی کے خاکے میں ان کے ذاتی تاثرات بھی نظر آئے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں۔

"انہیں دیکھ کر اندر سے دل کہتا تھا کہ یہ ایک عظیم انسان ہے اور عزت و احترام کا مستحق"(۳)

شاہد احمد دہلوی اور احمد بشیر دونوں نے خاکے میں شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں کو بیان کیا ہے جس سے صاحب خاکہ کی شخصیت قاری پر واضح ہو جاتی ہے۔ شاہد احمد دہلوی کو اس بات پر افوس ہے کہ میراجی جیسا بڑا انسان بھی زمانے کی ستم ظریفی کا شکار ہوا ان کے خاکے میں میراجی کی شاعری اور ان کے مجموعوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اور شاعری کے دو ضخیم مجموعے جو ان کے بھائی نے ردی میں دے دیے تھے جو ان کے گھر اور رشتہ چھوڑنے کا سبب بھی بنے۔

شاہد احمد دہلوی کا انداز سادہ و شگفتہ، جہاں مزاح بھی اور ظاہری تصویر کشی بھی جب کہ احمد بشیر کا انداز فلمائی اور تنقیدی ہے اور گہرے مشاہدے پر مشتمل ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے شخصیت کی انفرادیت، رویہ اور مزاج کو ادبی رنگ میں پیش کیا ہے۔ دونوں کے اسلوب میں واضح فرق ہونے کے باوجود اور خاکہ نگاری میں دونوں کا نمایاں مقام ہے۔

احمد بشیر کا خاکہ "قلندر" اور مولوی عبد الحق کا خاکہ "مولانا حسرت موہانی":

خاکہ نگاری کی صنف میں احمد بشیر کی ایک خصوصیت ان کی انفرادیت ہے جو انہیں دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے۔ احمد بشیر نے اپنے خاکوں میں صاحب خاکہ کی شخصیت کا نام ان کی خوبیوں اور خامیوں کا نچوڑ نکال کر خاکے کے موضوع بنایا۔ جو کہ دیگر ادیبوں کے ہاں کم نظر آتا ہے۔ احمد بشیر نے مولانا حسرت موہانی کی شخصیت پر جو خاکہ لکھا اسے "قلندر" کے نام سے پیش کیا ہے جب کہ مولوی عبد الحق نے حسرت موہانی کے نام سے پیش کیا ہے جو کہ ان کی کتاب "چند ہم عصر" میں شامل ہے۔

احمد بشیر نے مولانا حسرت موہانی پر جو خاکہ لکھا اس میں ان کی حسرت موہانی سے پہلی ملاقات کا ذکر ہے جس میں احمد بشیر نے مولانا کا انٹرویو کیا تھا۔ جب کہ مولوی عبد الحق کے خاکے میں مولانا حسرت موہانی کی شخصیت اور سیاست سے ان کا تعلق دکھایا گیا ہے۔ حلیہ نگاری دونوں ادیبوں کے خاکے میں نظر آتی ہے۔ احمد بشیر لکھتے ہیں:

> "آپ کی عمر اس وقت ۷۷ برس کی ہے۔ داڑھی بالکل سفید ہو چکی ہے۔ سر کے بال جھڑ چکے ہیں۔ چہرے پر جھریاں لیکن عام جسمانی صحب بری نہیں۔ بھوک باقاعدہ لگتی ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن ہیں۔ لیکن بینائی کچھ کم ہو گئی ہے"۔ (۴)

جبکہ مولوی عبد الحق ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> "اگر کوئی ناواقف پہلی بار مولانا حسرت موہانی کو دیکھتا تو سمجھتا کہ یہ کوئی مخبوط الحواس شخص ہے۔ ان کی ٹوپی پر جو اکثر ترکی ہوتی تھی آدھ آدھ انگل چیکٹ جما ہوتا تھا۔ داڑھی پریشان، لباس میں کوئی سلیقہ نہیں نہ میلا نہ اجلا، جوتے نے کبھی برش کی صورت نہ دیکھی تھی۔ آواز جھینگر سے ملتی جلتی لیکن

اس بے ڈول قالب میں بے پایاں روحانی قوت، اخلاقی جرات اور خلوص و صداقت تھی آزادی کا ایسا شہدائی کوئی کم ہو گا"۔(۵)

احمد بشیر کا خاکہ ۱۳ صفحات لہ طوالت پر مشتمل ہے جب کہ مولوی عبد الحق کا خاکہ مختصر ہے۔ احمد بشر کے خاکہ میں مولانا حسرت موہانی کی تمام تر زندگی کا مختصر احوال ملتا ہے۔ جبکہ مولوی عبد الحق کے خاکے میں مولانا کا حلیہ، سیاسی جدوجہد اور ادبی زندگی کا حوال شامل ہے۔ احمد بشیر کا انٹرویو نما خاکہ ہے جب کہ مولوی عبد الحق کا تعریفی خاکہ لگتا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کا خاکہ "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری ان کی بانی اور احمد بشیر کا خاکہ "پیرومرشد"

(قدرت اللہ شہاب پر) کا تقابلی جائزہ:

مرزا فرحت اللہ بیگ کی کتاب "نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی" اردو ادب کی مشہور معروف ہستی اردو ناول کے بانی کی شخصیت پر لکھی گئی جس میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی نذیر احمد کا حلیہ، چال ڈھال، کردار، عادات واطوار، نشت وبرخاست، علم سے ان کا لگاؤ اور ان کے کاروباری معاملات کو بڑی سادگی اور شگفتگی سے بیان کیا ہے جس سے ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس خاکے کو اردو ادب میں خاکہ نگاری کی صنف میں اولیت کا درجہ حاصل ہے جس میں باقاعدہ طور پر شخصیت نگاری کی گئی ہے۔ اس لیے مرزا فرحت اللہ بیگ کو اردو خاکہ نگاری کا بانی کہا جاتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ نے یہ خاکہ اپنے استاد کی شخصیت پر لکھا ہے۔ جس میں انہوں نے ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت کو دلچسپ اندامیں بیان کیا ہے۔

احمد بشیر کا خاکہ "پیر و مرشد" قدرت اللہ شہاب کی شخصیت پر لکھا گیا ہے۔ جو کہ آغاز میں معلوم ہوتا ہے کہ احمد بشیر نے قدرت اللہ شہاب کی کتاب شہاب نامہ پر قلم اٹھایا تھا جو کہ بعد میں خاکہ کی صورت اختیار کر گیا۔

احمد بشیر نے اس خاکہ میں شہاب نامہ کی تصویر کشی کی ہے اور ساتھ ہی قدرت اللہ شہاب کی شخصیت کو اجاگر کیا ہے۔ احمد بشیر کے خاکوں کی خاصیت یہ ہے کہ انہوں نے صاحب خاکہ کی خوبیوں اور کمزوریوں دونوں کو اپنے خاکوں میں بیان کیا ہے۔ اور ان کے خاکے کسی نہ کسی واقع کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں۔ جن میں ان کے مکالماتی گفتگو بھی شامل ہے۔

حلیہ نگاری دونوں ادیبوں کے ہاں نظر آتی ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے بھی اتنی خوبصورتی سے حلیہ نگاری کی ہے کہ قاری ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت زندہ اور محترک نظر آتی ہے۔

مرزا فرحت اللہ لکھتے ہیں:

> "آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا اندر کو دھنسی ہوئی تھیں بھویں گھنی اور آنکھوں کے اوپر سایہ افگن تھیں۔ آنکھوں میں غضب کی چمک تھی"۔(۶)

> "داڑھی بہت چھدری تھی، ایک ایک بال با آسانی گنا جا سکتا تھا"(۷)

احمد بشیر کا خاکہ "پیر و مرشد" ان کے تمام خاکوں میں سے طویل ہے لیکن مرزا فرحت اللہ بیگ کا خاکہ زیادہ طویل ہے۔ جس میں زیادہ طوالت سے کردار نویسی اور شخصیت نگار کی گئی ہے۔

احمد بشیر کے خاکے "پیر و مرشد" میں دیگر ادیبوں کا ذکر بھی ملتا ہے جیسے بانو قدسیہ، ابن انشاء اور اشفاق احمد وغیرہ۔

خاکہ نگاری میں یہ بات اہم ہے کہ صاحب خاکہ کی شخصیت کو بغیر کسی جانبداری سے خوبیوں اور کمزوریوں کے ساتھ بیان کیا جائے۔ اور یہ فن احمد بشیر اور مرزا فرحت اللہ بیگ دونوں کے خاکوں میں نظر آتا ہے۔ احمد بشیر نے قدرت اللہ شہاب کی خوبیوں اور خامیوں سمیت بیان کیا ہے۔ ایک مکالمے میں ان کے الفاظ کچھ یوں کہے گئے ہیں:

"میرے خیال میں آپ بہت نیک آدمی ہیں۔ مذہب پر آپ کا اعتقاد پختہ ہے۔۔۔۔۔۔۔ سوشلسٹوں کو آپ شبے کی نظر سے دیکھتے ہیں"۔(۸)

فرحت اللہ بیگ کے اس خاکے میں تصویر کے دونوں رخ بیان کیے گئے ہیں۔ مولوی ڈپٹی نذیر احمد کی تمام تر خوبیوں اور اوصاف کے ساتھ ان کی سخت اور کڑی طبیعت اور بخل اور ان کی سود خوری کا ذکر بھی خاکے میں موجود ہے۔ فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں۔

"سود لینا وہ جائز سمجھتے تھے۔ اگر کوئی حجت کرتا تو مارے تاویلوں کے اس کا ناطقہ بند کر دیتے۔ ایک تو حافظ دوسرے عالم تیسرے کسان بھلا ان سے کون ور سکتا تھا۔ اور تو اور خود مجھ سے سود لینے کو تیار ہو گئے"۔(۹)

خاکوں میں احمد بشیر کا انداز بے باک، حقیقت پسندی، مزاح اور تنقید پر مبنی ہے اور زبان اردو ہے۔ جب کہ فرحت اللہ بیگ کا اسلوب خوش طبعی، متانت و سنجیدگی، مزاح پر مبنی ہے اور زبان میں فارسی اور ہندی الفاظ کی آمیزش ہے۔

احمد بشیر کا خاکہ "چھپن چھری" اور سعادت حسن منٹو کا خاکہ "نور جہاں سرور جہاں" کا تقابلی جائزہ:

احمد بشیر نے خاکہ "چھپن چھری" کشور ناہید پر لکھا ہے جب کہ سعادت حسن منٹو نے خاکہ "نور جہاں سرور جہاں" گلوکارہ نور جہاں پر لکھا ہے۔ یہ خاکہ نور جہاں کی فنی مہارت، ذاتی زندگی اور فلمی دنیا کو بے پاک طور پر بیان کرتا ہے۔ جب خاکہ "چھپن چھری" کشور ناہید کی ادبی دنیا، دنیاوی زندگی اور ان کی ذاتی زندگی ہر روشنی ڈالتا ہے۔ دونوں خاکے اردو ادب میں خاکہ نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ جن میں شخصیت نگاری کی گئی ہے۔

سعادت حسن منٹو کا خاکہ "نور جہاں سرور جہاں" طویل ہے جب کہ احمد بشیر کا خاکہ "چھپن چھری" مختصر ہے مگر جامع ہے احمد بشیر نے بڑی بے باکی اور سچائی سے کشور ناہید پر خاکہ لکھا ہے جس میں چند پہلوؤں سے ہی کشور ناہید کی اچھائی اور برائی دونوں کو متوازن طور پر بیان کر دیا ہے۔ کشور ناہید حقوق نسواں کی علمبر دار تھیں لیکن آزاد خیال۔ احمد بشیر کا مراد کشور ناہید کی ادبی جدوجہد، نسائی خیالات اور سماجی کردار پر ہے۔ جو ان کی "چھپن چھری" جیسی تیز طبیعت کو دکھاتا ہے۔ جب کہ سعادت حسن منٹو کا مواد نور جہاں کی فلمی کیریئر، آزاد کی جادوگری اور ذاتی زندگی پر مبنی ہے۔ دونوں خاکہ نگاروں نے شخصی خاکہ نگاری میں شخصیت کی عادات و اطوار اور مزاج کو بے باکی اور برجستگی سے بیان کیا ہے احمد بشیر لکھتے ہیں۔

> "مگر میں سکینڈل کھڑا نا نہیں چاہتا۔ میں نے کہا۔ لوگوں کی بیویاں طلاقیں لینے لگیں گی ۔" ارے نہیں۔ وہ سمجھاتے ہوئے بولی۔ نہ کوئی طلاق لیتا ہے نہ دیتا ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ

ہے اس سے زندگیاں دلچسپ ہو جاتی ہیں بوریت دور ہو جاتی ہے بلکہ فائدہ ہی ہوتا ہے
سکینڈل میں "

نہ بھائی میں کسی کے خلاف سکینڈل نہیں گھڑاتا۔

تو اپنے ساتھ گھڑا لو۔"

کوئی بات بھی تو ہو میرے ساتھ خواہ مخواہ ؟

بات کا کیا ہے میں تمہارے دفتر آکر تمہارے زانو سہلا دوں گی تم فوٹو گرافر تیار رکھنا۔اور
یہ کہ کر وہ بدتمیزی سے قہقہے مارنے لگی"۔(۱۰)

سعادت حسن منٹو کا خاکہ "نور جہاں سرور جہاں" میں دیگر فلمی انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے افراد اور نور جہاں کی فیملی ممبر ز کا بھی ذکر ہے۔ سعادت حسن منٹو نے نور جہاں کی آواز کی بہت تعریف کی ہے اور ان کی ذاتی زنگی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ دونوں خاکہ نگار بے باک ہیں اور طنزیہ انداز میں شخصیت کی خاکہ نگاری کی گئی ہے۔ دونوں خاکے تصویر کشی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ سعادت حسن منٹو کا انداز ملاحظہ کیجئے:

"نور جہاں اب خوب نکھر گئی تھی۔ مرد کی قربت بھی عورت کے حسن کے لیے کتنی ضروری ہوتی ہے۔ اس کے جسم کے خطوط اب واضح شکل اختیار کر چکے تھے وہ تمام خالی جگہیں جو لاہور میں پر نہ ہوئی تھیں۔ یہاں بمبئی میں پر ہوگئی تھیں اور اس پر جسم کی لذتوں کے قریب قریب تمام اسرار منکشف ہو چکے تھے۔ نور جہاں گو اب بھی لوگوں کی زبان پر یہی نور جہاں تھی۔ مگر وہ عشق محب کا جھولا جھول کر ان تمام جھونٹوں سے آشنا ہو چکی تھی جو اس کی رسیوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں"۔(۱۱)

اس خاکے میں نور جہاں کی زندگی کے مختلف پہلو، ان کے کیریئر کے اتار چڑھاؤ، اور ان کی شخصیت کے وہ گوشے نمایاں کیے گئے ہیں جو عام طور پر پر نظر نہیں آتے۔ یہ خاکہ بے جا طولت پر مبنی ہے جب کہ احمد بشیر کا خاکہ چھپن چھری مختصر ہے لیکن اس میں شخصی خاکہ جامع انداز میں کھینچا گیا ہے۔

حواشی:

۱۔ جو ملے تھے راستے میں، ص، ۸۲

۲۔ گنجینہ گوہر، ص، ۱۳۸

۳۔ ایضا، ص، ۱۲۳

۴۔ جو ملے تھے راستے میں، ص، ۶۹۔۶۸

۵۔ چند ہم عصر، ص، ۳۶۱

۶۔ ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی، ص، ۲۹

۷۔ ایضاً، ص، ۳۰

۸۔ جو ملے تھے راستے میں، ص، ۱۶۹

۹۔ نذیر احمد کی کہانی، ص، ۶۱

۱۰۔ جو ملے تھے راستے میں، ص، ۲۰۰

۱۱۔ نور جہاں سرور جہاں۔ سعادت حسن منٹو، ص، ۵۴

باب ششم

ماحصل

اس تحقیقی مقالے میں احمد بشیر کی خاکہ نگاری کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ مختلف ابواب میں ان کی شخصیت، فن اور اسلوب کا جائزہ لینے کے بعد کچھ اہم نتائج سامنے آئے ہیں جو اردو خاکہ نگاری میں احمد بشیر کے منفرد مقام کو واضح کرتے ہیں۔

احمد بشیر کی خاکہ نگاری میں سب سے نمایاں خصوصیت ان کی **بے باکی اور سچائی** ہے۔ انہوں نے کسی شخصیت کو مثالی یا ناقابل تنقید نہیں سمجھا۔ خاکہ "چھپن چھری" میں کشور ناہید کی شخصیت کو جس برہنہ انداز میں پیش کیا گیا، وہ اردو ادب میں ایک جرأت مندانہ قدم تھا۔ اسی طرح "سورما" میں ممتاز مفتی کی روحانی بلندیوں کے ساتھ ان کے تکبر اور سختی کو بھی بیان کیا گیا۔ یہ صداقت احمد بشیر کی خاکہ نگاری کی روح ہے۔

مشاہدے کی گہرائی احمد بشیر کا ایک اور امتیاز ہے۔ انہوں نے محض ظاہری خدوخال تک محدود نہیں رہتے بلکہ شخصیت کی باطنی کیفیات، نفسیاتی الجھنوں اور سماجی تضادات کو بھی پیش کیا۔ "اکیلا" میں میراجی کی تنہائی اور خود پسندی کو اس طرح بیان کیا گیا کہ ایک پیچیدہ شخصیت کی تہہ داری سامنے آگئی۔

احمد بشیر کے **عنوانات کا انتخاب** بھی ان کی فنی بصیرت کا ثبوت ہے۔ "قلندر"، "جپسی"، "شعبدہ باز"، "موچھا" جیسے عنوانات محض نام نہیں بلکہ شخصیت کی مکمل تصویر ہیں۔ یہ عنوانات پڑھتے ہی قاری کے ذہن میں ایک خاص تصور ابھر آتا ہے جو خاکے کے مطالعے سے مزید واضح ہوتا جاتا ہے۔

اختصار میں جامعیت احمد بشیر کی ایک نمایاں خوبی ہے۔ ان کے خاکے عموماً طویل نہیں لیکن چند صفحات میں وہ شخصیت کے ایسے گوشے کھولتے ہیں جو قاری کو صاحب خاکہ سے متعارف کرا دیتے ہیں۔ "موچھا" میں بریگیڈیئر عاطف کی پیچیدہ شخصیت کو صرف گیارہ صفحات میں بیان کر دیا گیا۔

احمد بشیر کا **اسلوب سادہ، سلیس اور براہ راست** ہے۔ وہ فضول تکلف سے پرہیز کرتے ہیں اور عام فہم زبان میں اپنی بات کہتے ہیں۔ ان کی تحریر میں **مزاح** بھی ہے لیکن یہ مزاح کٹاکش میں تبدیل نہیں ہوتا۔ "جپسی" میں احسان دانش کی زندگی کے واقعات مزاحیہ انداز میں بیان کیے گئے لیکن شخصیت کی عزت قائم رہی۔

احمد بشیر کے خاکوں میں **فلمائی تکنیک** کا استعمال واضح ہے۔ وہ واقعات کو منظر بہ منظر پیش کرتے ہیں جیسے کوئی فلم چل رہی ہو۔ "انٹرویو" میں مولانا چراغ حسن حسرت کے دفتر کا منظر، "قلندر" میں حسرت موہانی سے ملاقات - یہ سب مناظر قاری کی آنکھوں کے سامنے زندہ ہو جاتے ہیں۔

مکالمات کا استعمال احمد بشیر کے خاکوں کو زندگی عطا کرتا ہے۔ انہوں نے صرف تیسرے شخص میں بیانیہ نہیں لکھا بلکہ خود بھی کردار کے طور پر خاکے میں شامل ہیں۔ یہ تکنیک قاری کو واقعات کا حصہ بنا دیتی ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے خاکہ نگاری کی بنیاد رکھی، رشید احمد صدیقی نے اسے شگفتگی عطا کی، اور سعادت حسن منٹو نے اسے افسانوی رنگ دیا۔ احمد بشیر نے اس روایت کو **صحافتی حقیقت پسندی** سے مالا مال کیا۔ ان کے خاکے نہ محض تعریفی ہیں نہ صرف تنقیدی - بلکہ متوازن اور مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔

مولوی عبدالحق کے خاکے تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں، شاہد احمد دہلوی کے خاکے ادبی تاثرات ہیں، لیکن احمد بشیر کے خاکے **زندہ شخصیات** ہیں۔ ان کے خاکے پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے صاحب خاکہ ہمارے سامنے بیٹھا بات کر رہا ہے۔

احمد بشیر نے اردو خاکہ نگاری کو کئی اعتبار سے آگے بڑھایا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ خاکہ صرف عظیم شخصیات پر ہی نہیں لکھا جا سکتا - "جپسی" میں احسان دانش جیسے عام آدمی کو بھی خاکے کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے خاکہ نگاری میں **جنس کی قید** کو بھی توڑا اور کشور ناہید پر جرأت مندانہ خاکہ لکھا۔

احمد بشیر نے **سماجی و سیاسی شعور** کو بھی خاکوں میں شامل کیا۔ "مجاہد" میں وارث میر کی قربانیاں، "راستے کا کنکر" میں میجر اسحاق کی جدوجہد - یہ خاکے محض شخصیت نگاری نہیں بلکہ اپنے دور کی تاریخ بھی ہیں۔

ان کے خاکوں میں **ادبی دنیا کی اندرونی کہانی** بھی محفوظ ہے۔ "سورما" میں **ممتاز مفتی**، "پیر و مرشد" میں **قدرت اللہ شہاب**، "اکیلا" میں میرا جی - یہ سب ایسے خاکے ہیں جو ہمیں بیسویں صدی کی اردو ادبی دنیا میں لے جاتے ہیں۔

احمد بشیر کے خاکوں میں کہیں کہیں **بے جا طوالت** بھی نظر آتی ہے، خاص طور پر "پیر و مرشد" میں۔ کچھ خاکوں میں دیگر شخصیات کا ذکر اتنا تفصیل سے ہے کہ اصل موضوع سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ تاہم یہ معمولی خامیاں ان کی مجموعی کامیابی پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔

احمد بشیر نے صرف تیرہ خاکے لکھے جو کہ تعداد میں کم ہیں۔ اگر وہ مزید خاکے لکھتے تو اردو ادب مالا مال ہو جاتا۔ ان کے خاکوں پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے خاص طور پر **نسائی نقطہ نظر** اور **پس نو آبادیاتی تھیوری** کے تناظر میں۔

احمد بشیر کی خاکہ نگاری اردو ادب میں ایک سنگ میل ہے۔ انہوں نے اپنی بے باکی، صداقت اور فنی مہارت سے ثابت کیا کہ خاکہ نگاری محض تعریف یا تنقید کا نام نہیں بلکہ انسانی شخصیت کی مکمل اور متوازن تصویر کشی ہے۔ ان کے خاکے نہ صرف ادبی دستاویز ہیں بلکہ اپنے دور کی سماجی، سیاسی اور ثقافتی تاریخ کا آئینہ بھی ہیں۔

یونس جاوید نے احمد بشیر کے بارے میں لکھا: "وہ جو کچھ بھی ہے سامنے ہے کھرا ہے۔" یہی کھرا پن احمد بشیر کی خاکہ نگاری کی روح ہے۔ وہ زندگی بھر اصولوں پر قائم رہے اور اپنی تحریروں میں بھی اسی سچائی کو قائم رکھا۔

اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں احمد بشیر کا نام ہمیشہ ایک **سچے، بے باک اور جرأت مند** خاکہ نگار کے طور پر زندہ رہے گا۔ ان کے خاکے آنے والی نسلوں کے لیے نہ صرف ادبی ورثہ ہیں بلکہ سچائی اور اصول پسندی کی ایک مثال بھی ہیں۔

کتابیات:

جو ملے تھے راستے میں، احمد بشیر، مرتب یونس جاوید

اردو خاکہ نگاری، شاہد حنائی۔

اردو میں خاکہ نگاری، صابرہ سعید، ناشر مکتبہ شعرہ حکمت حیدرآباد، ۱۹۷۸ء

احمد بشیر شخصیت اور فن از محمد ظہیر بدر، اکادمی ادبیات پاکستان ۲۰۱٦

مقالہ: احمد بشیر۔ حیات و فن، مقالہ نگار محمد ریاض احمد (ریاض) ۲۰۱۳۔۲۰۱٦ء، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد اکتوبر ۲۰۱٦۔

چار چاند، نیلم احمد، بشیر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۱ء،

مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی، از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دھلوی، ایجوکیشنل بک ہاوس تاجران کتب، ۱۹۵۲ء

نور جہاں سرور جہاں، از سعادت حسن منٹو، مکتبہ جدید، اردو بازار دہلی، ۱۹۵۳۔

چند ہم عصر، مولوی عبد الحق، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۵۹ء،

گنجینہ گوہر، خاکے، شاہد احمد دہلوی، مکتبہ نیا دور کراچی ۱۹٦۲ء۔